ماہنامہ

اشراق

لاہور

مئی ۲۰۲۳ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”ہر نعمت درحقیقت خدا کا فضل اور اُس کی عنایت ہے۔ اِس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کا شکر ادا کیا جائے، اِس لیے کہ یہ سب کچھ اُس نے امتحان کے لیے دیا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ اُس کے بندے اِن نعمتوں کو پا کر شکر گزار ہوتے ہیں یا ناشکری اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اِس امتحان کا نتیجہ بھی ایک دن لازماً نکلنا ہے، قوموں کے لیے اِسی دنیا میں اور افراد کے لیے قیامت میں، جب ہر شخص کو جزا و سزا کے لیے اٹھایا جائے گا۔“

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارہ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۵ شمارہ ۵ مئی ۲۰۲۳ء شوال المکرم ۱۴۴۴ھ

فہرست

شذرات

دین میں بحث واستدلال کے بنیادی اصول — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: سبا ۳۴: ۱۰-۲۱ (۲) — جاوید احمد غامدی — ۷

معارف نبوی

لڑکپن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا — جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز — ۱۷

مقالات

”میزان“ — توضیحی مطالعہ: حدود و تعزیرات (۱) — محمد عمار خان ناصر — ۲۴

نقطۂ نظر

ہمارا تخلیقی اور تحقیقی انحطاط: اسباب و تدارک — محمد رضوان سلیم سندھو — ۳۳

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۱۹) — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۷

اصلاح و دعوت

داعی اور رہنما یا خدا کا انتخاب — محمد ذکوان ندوی — ۴۴

بچوں کی شخصیت سازی سے پرہیز اور ان کی — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۴۷

ضروری فراغت

قافلۂ نوحہ گراں — خورشید احمد ندیم — ۵۱

وفیات

والد محترم — چند یادیں، چند باتیں — محمد حسن الیاس — ۵۴

پروفیسر نجات اللہ صدیقی: ایک فکری مسافر (۲) — ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی — ۶۰

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

دین میں بحث و استدلال کے بنیادی اصول

یہ سوال نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ وہ کیا اصول ہیں جنھیں دینی مباحث میں افہام و تفہیم، بحث و استدلال اور اتفاق و اختلاف کی بنیاد بننا چاہیے؟ ہمارے نزدیک اِس ضمن میں دو اصولوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ عقل و نقل کے مبادیات ہیں، جو دین و شریعت کے فہم میں قولِ فیصل کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ درج ذیل ہیں:

اول، دین میں قرآنِ مجید کی حیثیت میزان اور فرقان کی ہے۔[1] اِس کے معنی یہ ہیں کہ دین سے متعلق تمام معاملات میں اِسے فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ احادیث و آثار، تاریخ و سیرت، فقہ و تفسیر کے ہر قول، ہر روایت اور ہر رائے کو اِس کی ترازو میں تولا جائے گا اور اِس کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ وہی چیز قابل قبول ہو گی جسے یہ قبول کرے گا۔ جسے یہ رد کرے گا، اُسے دین یا اُس کی شرح و وضاحت کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

اِس اصول پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے اور اِس میں اگر کوئی چیز

۱۔ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ.(الشوریٰ ۴۲: ۱۷)

”اللہ ہی ہے، جس نے اپنی یہ کتاب قول فیصل کے ساتھ اتاری ہے اور (اِس طرح حق و باطل کو الگ الگ کرنے کے لیے) اپنی میزان نازل کر دی ہے۔“

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا.(الفرقان ۲۵: ۱)

”بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان اتارا ہے، اِس لیے کہ وہ اہل عالم کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔“

www.javedahmadghamidi.com

قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اُسے قبول نہ کیا جائے۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی لکھتے ہیں:

"...دین میں اُس کی حیثیت میزان اور فرقان کی ہے۔ وہ ہر چیز پر نگران ہے اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے اُسے حکم بنا کر اتارا گیا ہے، لہٰذا یہ بات تو مزید کسی استدلال کا تقاضا نہیں کرتی کہ کوئی چیز اگر قرآن کے خلاف ہے تو اُسے لازماً رد ہونا چاہیے۔... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیثیت نبوت و رسالت میں جو کچھ کیا، اُس کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔ لہٰذا حدیث کے بیش تر مضامین کا تعلق اُس سے وہی ہے، جو کسی چیز کی فرع کا اُس کی اصل سے اور شرح کا متن سے ہوتا ہے۔ اصل اور متن کو دیکھے بغیر اُس کی شرح اور فرع کو سمجھنا، ظاہر ہے کہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ حدیث کو سمجھنے میں جو غلطیاں اب تک ہوئی ہیں، اُن کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے۔ عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل، عذاب قبر اور شفاعت کی روایتیں، 'أمرت أن أقاتل الناس'[2] اور 'من بدل دينه فاقتلوه'[3] جیسے احکام اِسی لیے الجھنوں کا باعث بن گئے کہ اُنھیں قرآن میں اُن کی اصل سے متعلق کر کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔" (میزان ۶۳، ۶۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوم، قرآنِ مجید صاف اور واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اِس کے الفاظ و اسالیب میں کوئی الجھاؤ، کوئی ابہام، کوئی شذوذ اور کوئی غرابت نہیں ہے۔ یہ اپنا مدعا پوری صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، جسے اہل علم کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

استاذِ گرامی نے "میزان" میں لکھا ہے:

"...قرآن صرف عربی ہی میں نہیں، بلکہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ یعنی ایک ایسی زبان میں جو نہایت واضح ہے، جس میں کوئی اینچ پینچ نہیں ہے، جس کا ہر لفظ صاف اور جس کا ہر اسلوب اپنے مخاطبین کے لیے ایک مانوس اسلوب ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ.

(الشعراء ۲۶: ۱۹۳-۱۹۵)

"اِس کو تمھارے دل پر روح الامین لے کر اترا ہے، اِس لیے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح تم بھی خبردار

۲۔ بخاری، رقم ۲۵۔ مسلم، رقم ۱۲۹۔ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اِن لوگوں سے جنگ کروں۔"

۳۔ بخاری، رقم ۳۰۱۷۔ "جو اپنا دین تبدیل کرے، اُسے قتل کر دو۔"

کرنے والے بنو، نہایت صاف عربی زبان میں۔‘‘

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ.(الزمر ۳۹: ۲۸)

’’ایسے قرآن کی صورت میں جو عربی زبان میں ہے، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، اِس لیے کہ وہ خدا کے عذاب سے بچیں۔‘‘

قرآن کے بارے میں یہ ایک واضح حقیقت ہے۔ اِسے مانیے تو اِس کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ قرآن کا کوئی لفظ اور کوئی اسلوب بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے شاذ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے مخاطبین کے لیے بالکل معروف اور جانے پہچانے الفاظ اور اسالیب پر نازل ہوا ہے۔ زبان کے لحاظ سے اُس کی کوئی چیز اپنے اندر کسی نوعیت کی کوئی غرابت نہیں رکھتی، بلکہ ہر پہلو سے صاف اور واضح ہے۔ چنانچہ اُس کے ترجمہ و تفسیر میں ہر جگہ اُس کے الفاظ کے معروف معنی ہی پیش نظر رہنے چاہییں۔ اِن سے ہٹ کر اُس کی کوئی تاویل کسی حال میں قبول نہیں کی جاسکتی۔‘‘(۲۰-۲۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہمارے روایتی مکاتب میں فکر و نظر کی بیش تر غلط فہمیوں کا باعث عقل و نقل کے اِنھی اصولوں سے گریز ہے۔ قرآن کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ نصوص کو ذیلی اور احادیث کے ظنی الثبوت اور ظنی الدلالہ نصوص کو اصل مانا جاتا ہے۔ احادیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کے بجاے قرآن کی احادیث کی روشنی میں تاویل کی جاتی ہے۔ یہی معاملہ عربی زبان کے معروف الفاظ و اسالیب کا ہے۔ بعض اوقات اُنھیں اُن کے مستعمل معانی سے ہٹا کر شاذ اور اجنبی مفاہیم پر محمول کر لیا جاتا ہے۔ علم و فکر کے اِس غلط انداز اور فہم و استدلال کی اِس معکوس ترتیب سے قرآن کے میزان اور فرقان ہونے کی منزلت مجروح ہوتی ہے، زبان و بیان کے مسلمات صرفِ نظر ہوتے ہیں اور ایسے مدعا کا ابلاغ ہوتا ہے جو بعض پہلوؤں سے قرآن و سنت کے مطمح نظر کی مخالفت یا مغائرت پر منتج ہوتا ہے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ سبا

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا
لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿١٠﴾ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ

(خدا کے بندو، یہی نشانیاں اُن سرگذشتوں میں بھی ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں)۔ ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے خاص فضل عطا فرمایا تھا۔[16] ہم نے حکم دیا تھا کہ پہاڑو، تم بھی اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاؤ اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا تھا۔[17] ہم نے لوہے کو اُس کے لیے نرم

۱۶۔ داؤد علیہ السلام بیت اللحم کے رہنے والے قبیلۂ یہوداہ کے ایک معمولی نوجوان تھے۔ طالوت کی پہلی جنگ میں، جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۲) میں ہو چکا ہے، اُنھوں نے جالوت جیسے گرانڈیل دشمن کو قتل کر دیا۔ یہ چیز کافی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کا تارا بن جاتے۔ چنانچہ یہی ہوا اور طالوت کی وفات کے بعد وہ پہلے حبرون میں یہودیہ کے فرماں روا بنائے گئے، پھر چند سال بعد بنی اسرائیل کے تمام قبائل نے مل کر اُن کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ یروشلم اُنھی کے زمانے میں فتح ہوا اور اُسے دولت اسرائیل کا پایۂ تخت بنایا گیا۔ اُن کی سلطنت کے حدود خلیج عقبہ سے دریاے فرات کے مغربی کناروں تک پھیلے ہوئے تھے جن پر وہ ۹۶۵ ق م تک حکومت کرتے رہے۔ اُن پر اللہ تعالیٰ کی مزید عنایت یہ ہوئی کہ اُنھیں پیغمبر بنا دیا گیا اور اُن پر زبور نازل ہوئی جو تورات کے بعد دوسری باقاعدہ کتاب ہے۔

۱۷۔ یہ اُس سوز و گداز کی طرف اشارہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو عطا فرمایا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١﴾
وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ

کر دیا تھا[18] کہ پوری اور کشادہ ڈھیلی ڈھیلی زرہیں بناؤ اور اُن کی بناوٹ میں بھی پورے تناسب کو ملحوظ رکھو[19] اور تم سب اچھا عمل کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اُسے میں دیکھ رہا ہوں۔[20] ۱۰-۱۱

اِسی طرح سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا۔[21] (اُس کے جہازوں کو لے کر) ہوا کا جانا

"...یوں تو اِس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور جب وہ تسبیح کرتی ہے تو لازماً تسبیح کرنے والوں کی ہم نوائی بھی کرتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت داؤد کو خاص نوع کا دل گداختہ اور خاص قسم کا لحن عطا فرمایا تھا، اُسی طرح اپنے خاص حکم سے پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس وقت حضرت داؤد اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، وہ بھی اُن کے ساتھ اُس میں شریک ہوں۔" (تدبر قرآن ۶/ ۳۰۰)

۱۸۔ یعنی اُس کو لوہا پگھلانے کا فن سکھا دیا تھا۔ آیت میں اِس کے لیے 'اَلَنَّا لَهٗ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر کا مرجع داؤد علیہ السلام ہیں۔ لیکن اِس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اُسی طرح کی نسبت ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تاج محل شاہ جہاں نے بنایا تھا۔

۱۹۔ اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اُن کے دور میں سائنسی علوم میں ایسی ترقی ہوئی کہ لوہے کی زرہیں ایسی ڈھیلی ڈھالی بننے لگیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی کپڑے سے بنائی گئی ہیں جن کا پہننا نہایت آسان تھا، لیکن حفاظت اُسی طرح کرتی تھیں، جس طرح لوہے کی کوئی مضبوط چیز کر سکتی ہے۔ اُن کے دور کی یہی صنعت تھی جس نے اُن کی فوج کو ناقابل تسخیر بنا دیا اور اِس کے نتیجے میں وہ دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت بن گئے۔

۲۰۔ یعنی اِس نعمت کو پا کر اِس سے جو اخلاقی تقاضے پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی اُنھیں بتائے گئے کہ اِسے خدا کی امانت سمجھ کر استعمال کریں اور یاد رکھیں کہ جس خدا نے یہ نعمت بخشی ہے، وہ ہر وقت دیکھ رہا ہے کہ وہ اِسے کہاں استعمال کرتے ہیں۔

۲۱۔ یعنی خدمت میں لگا دیا تھا۔ آیت میں 'سُلَيْمٰن' کا 'ل' اِس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'سَخَّرْنَا' یہاں محذوف ہے۔ سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد کے بیٹے تھے جو اُن کے بعد نبوت اور بادشاہی، دونوں میں اُن کے

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا
نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴿۱۲﴾ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ

بھی مہینے بھر کا ہوتا تھا اور آنا بھی مہینے بھر کا ہوتا تھا۔[22] اور ہم نے اُس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا[23] اور ایسے جنات بھی مسخر کر دیے تھے جو اُس کے پروردگار کے حکم سے اُس کے آگے کام کرتے تھے[24] اور فرما دیا تھا کہ اُن میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا، اُسے ہم آگ کا عذاب چکھائیں گے۔[25] وہ[26] اُس کے لیے جو وہ چاہتا تھا، بناتے تھے: محرابیں،[27] مجسمے،[28]

جانشین ہوئے۔ اُن کا زمانۂ سلطنت ۹۶۵ ق م سے ۹۲۶ ق م تک ہے۔ اُن کے لیے ہوا کو مسخر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے بحری بیڑے اِس قدر ترقی یافتہ تھے کہ سمندر میں مہینوں تک سفر کر سکتے تھے۔ آگے اِسی کی وضاحت ہے۔

۲۲۔ یہ عامل کا ذکر کر کے معمول کی طرف اشارہ کرنے کا اسلوب ہے اور اِس سے مقصود وہی جہازوں کا آنا جانا ہے جو ہم نے ترجمے میں واضح کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصل تصرف ہواؤں ہی میں ظاہر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبے لمبے سفر اِسی صورت میں ممکن تھے، جب یہ جہازات نہایت بڑے بڑے بھی ہوں اور اُن کے ساتھ ہوا کے کنٹرول کرنے کا نظام اتنا اعلیٰ اور مستحکم ہو کہ وہ ہر قسم کے سمندروں کے اندر ہر نوع کی ہواؤں کا نہایت خوبی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۳۰۱)

۲۳۔ یعنی تانبا نکال کر اتنی بڑی مقدار میں پگھلایا جاتا تھا کہ اُن کی سلطنت میں گویا تانبے کا چشمہ بہ رہا تھا۔

۲۴۔ یعنی اُن کو ہم نے ایک ایسا علم بھی عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے سے وہ شریر جنوں کو قابو کر کے اُن سے مختلف قسم کے کام لیتے تھے۔

۲۵۔ مطلب یہ ہے کہ جنوں پر تصرف کا یہ معجزہ براہ راست ہمارے حکم سے صادر ہوتا تھا اور اگر وہ حکم عدولی کرتے تو اُن کو سزا بھی ہم ہی دیتے تھے۔

۲۶۔ یہاں سے آگے اُن کاموں کی تفصیل ہے جو حضرت سلیمان جنوں سے لیتے تھے۔

۲۷۔ زمانۂ قدیم میں جو عمارتیں بنائی جاتی تھیں، اُن کا سب سے نمایاں حصہ اُن کی محرابیں ہی ہوتی تھیں اور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور پہاڑ جیسی چولھوں پر جمی ہوئی دیگیں[۲۹] ——— داؤد کے گھر والو، (اپنے پروردگار کا) شکر ادا کرتے رہو۔[۳۰] حقیقت یہ ہے کہ میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار

تعمیری آرٹ کا سب سے زیادہ مظاہرہ بھی اُنھی پر کیا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ ذکر اِسی بنا پر کیا ہے۔ اِس سے عظیم الشان عمارتوں کی طرف ذہن آپ سے آپ منتقل ہو جاتا ہے، اُن کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۲۸۔ یہ، ظاہر ہے کہ اُسی قسم کے مجسمے اور تصویریں ہوں گی جن میں مذہبی تقدس کا کوئی شائبہ نہ ہو، بلکہ مجرد آرٹ کے پہلو سے بنائی گئی ہوں۔ اِس لیے کہ حضرت سلیمان کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے تھے جسے اُن کی شریعت میں واضح طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ استثنا میں ہے:

”لعنت اُس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خدا کے نزدیک مکروہ ہے، اُس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔“ (۲۷: ۱۵)

اِسی طرح خروج میں فرمایا ہے:

”خداوند تیرا خدا جو تجھے ملک مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے، تو اُن کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ اُن کی عبادت کرنا کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔“ (۲۰: ۲-۵)

۲۹۔ یہ اُن کے جود و کرم کو نمایاں کیا ہے کہ اُن کی سلطنت میں جس طرح سائنس اور آرٹ اور تعمیرات کا فن اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا، اُسی طرح غربا و مساکین کی خدمت بھی ریاست کے فرائض میں شامل تھی اور اُس کا اہتمام بھی نہایت فیاضی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اگر آپ کو یہ کہنا ہو کہ فلاں شخص بڑا فیاض ہے، اُس کے خوان کرم سے ایک خلق عظیم کی پرورش ہو رہی ہے، تو فصیح عربی میں اُس کی تعبیر کے لیے یہ دو حرف کافی ہوں گے کہ 'لَهٗ قُدُوْرٌ رّٰسِيٰتٌ'۔ عرب شعرا نے حاتم اور اپنے دوسرے فیاضوں کے لیے یہی استعارہ استعمال کیا ہے۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۳۰۵)

۳۰۔ یعنی اِن نعمتوں کے ساتھ ہم نے یہ ہدایت بھی اُس کو اور اُس کے خاندان والوں کو کی تھی کہ اِنھیں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

فَلَمَّا قَضَيۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَوۡتَ مَا دَلَّهُمۡ عَلٰى مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الۡاَرۡضِ تَاۡكُلُ مِنۡسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ الۡغَيۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِى الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ ﴿۱۴﴾

ہوتے ہیں۔[۳۱] ۱۲-۱۳

(یہی جنات ہیں جنھیں تم عالم الغیب سمجھ کر خدا کے شریک ٹھیراتے ہو۔ یہ سلیمان کی غلامی کرتے رہے)۔ پھر جب ہم نے اُس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو اُن کو زمین کے کیڑے[۳۲] ہی نے اُس کی موت کا پتا دیا جو اُس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ چنانچہ سلیمان جب گر پڑا، تب جنوں کی حقیقت خود اُن پر بھی کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اِس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔[۳۳] ۱۴

پا کر بہک نہ جانا، بلکہ اپنے پروردگار کی شکر گزاری کے ساتھ اُس راستے پر گام زن رہنا جس کی طرف اُس نے تمھاری رہنمائی فرمائی ہے۔

۳۱۔ یہ تنبیہ بھی ہے اور اپنے ایک شکر گزار بندے پر اظہار اعتماد بھی۔ مطلب یہ ہے کہ شکر کا امتحان ایک مشکل امتحان ہے۔ اِس میں کم ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ تاہم توقع ہے کہ تم اُنھی میں شامل ہوگے۔

۳۲۔ اِس کیڑے کا ذکر یہاں جن قرائن کے ساتھ ہوا ہے، اُس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد دیمک ہے۔

۳۳۔ یعنی خود جنوں پر بھی واضح ہو گیا کہ اُن کے علم کی حقیقت کیا ہے جو وہ استراق سمع سے کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ حقیقت جس واقعے سے کھلی، اُس کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنے کسی تعمیری کام کی نگرانی کرتے ہوئے، جس میں جن بھی لگے ہوئے تھے، حضرت سلیمان کی موت کا وقت آ گیا اور فرشتۂ اجل نے اُن کی روح قبض کر لی۔ اُن کے اعیان و اکابر اور اہل خاندان نے جب دیکھا کہ موت کے باوجود اُن کا جسم عصا کے سہارے بدستور قائم ہے تو اُنھوں نے اِس خیال سے کہ جنات جس کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے، اُنھیں اُسی حالت میں رہنے دیا۔ یہ تدبیر ایک عرصے تک کامیاب رہی۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ اِس اثنا میں دیمک نے عصا کو نیچے سے کھا لیا جس کے بعد سلیمان علیہ السلام کا جسد مبارک زمین پر گر پڑا۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۵ كُلُوْا مِنْ
رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ

(قریش کے لوگو، سبا[۳۴] نے بھی وہی کیا تھا جو تم کر رہے ہو، دراں حالیکہ) اہل سبا کے لیے اُن کے مسکن ہی میں بہت بڑی نشانی تھی۔[۳۵] دائیں بائیں، باغوں کی دو قطاریں۔[۳۶] (یہ سب زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ) اپنے پروردگار کی بخشی ہوئی روزی کھاؤ اور اُس کے شکر گزار رہو۔ زمین زرخیز و شاداب اور پروردگار[۳۷] بخشش فرمانے والا۔ پھر بھی اُنھوں نے سرتابی کی تو بالآخر ہم نے اُن پر بند کا سیلاب[۳۸] بھیج دیا اور اُن کے باغوں کو اُن کے لیے دو ایسے باغوں میں بدل دیا جن میں بدمزہ

۳۴۔ سبا قدیم زمانے کی ایک دولت مند قوم تھی۔ اُسی کے نام پر یمن کے جنوب مغربی علاقے کو بھی اُس زمانے میں سبا کہا جاتا تھا۔ اُس کا دارالحکومت مارب تھا جس کے کھنڈر آج بھی اِس علاقے میں موجود ہیں۔ قوم سبا کے عروج کا زمانہ ۱۱۰۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک رہا۔ اِس کے بعد وہ روبہ زوال ہوئی، یہاں تک کہ ایک خدائی آفت نے آکر اُس کے مسکن کو ویرانہ بنا دیا۔ آگے اِسی واقعے کا ذکر ہے۔

۳۵۔ یعنی اِس بات کی نشانی کہ جو کچھ اُن کو میسر ہے، وہ اُن کا اپنا آفریدہ نہیں ہے، بلکہ اُن کے پروردگار کا عطیہ ہے۔ لہٰذا وہی اُن کے شکر و سپاس اور بندگی و عبادت کا مستحق ہے اور اُسی کو ہونا چاہیے۔

۳۶۔ آیت میں مثنیٰ دو باغوں کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ باغوں کی دو قطاروں کے مفہوم میں ہے۔ یہ اُن کے علاقے کی تصویر ہے کہ اُس میں داخل ہوں تو اُس کی بڑی شاہ راہ کے دونوں جانب باغ ہی باغ نظر آتے تھے۔

۳۷۔ یعنی وہ پروردگار جو لوگوں کی ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود اُن کے لیے اپنا خوان کرم بچھاتا اور اُس پر اسی طرح نعمتوں کے انبار لگا دیتا ہے۔

۳۸۔ یعنی وہ سیلاب جو بند ٹوٹنے سے آیا۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'عَرِم' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'عرمة' کی جمع ہے جس کے معنی تہ بہ تہ اکٹھے کیے ہوئے پتھروں کے ہیں۔ یہیں سے یہ اُس بند یا پشتے کے لیے استعمال ہونے لگا جو کسی وادی میں پانی روکنے کے لیے بنایا جائے۔ جنوبی عرب کی زبان میں یہی لفظ 'عرمن' بولا جاتا

وَّشَیۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِیۡلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِکَ جَزَیۡنٰھُمۡ بِمَا کَفَرُوۡا ؕ وَھَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡکَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾

پھل اور جھاؤ کے درخت اور بیری کی کچھ تھوڑی سی جھاڑیاں تھیں۔ یہ ہم نے اُن کی ناشکری کا بدلہ اُنھیں دیا اور ایسا بدلہ ہم ناشکروں ہی کو دیا کرتے ہیں۔[۳۹] ۱۵-۱۷

تھا۔ سبا کے دارالحکومت مارب کے نام پر اِس بند کو سد مارب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ آب پاشی کے لیے پانی کا ایک بڑا ذخیرہ اور اُس زمانے کے انجینئروں کا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا جو ۵۴۲ء اور ۵۷۰ء کے درمیان کسی وقت ٹوٹ گیا*جس کے نتیجے میں وہی علاقہ جو کبھی جنت نظیر تھا بالکل تباہ ہو کر کڑوے کسیلے پھلوں کے خود رو درختوں اور جھاؤ اور بیری کی جھاڑیوں کا جنگل بن گیا۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ سیلاب نے کسی ایسی مٹی یا ریت کی تہ پورے علاقے پر جما دی جس سے بچے کھچے درختوں کا مزاج بھی بدل گیا۔ قرآن نے یہ اِسی بند کے ٹوٹنے کا ذکر کیا ہے۔ سبا کے لوگ اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں روبہ زوال تو اِس سے صدیوں پہلے ہو چکے تھے۔ یہ گویا نزع کے عالم میں سسکتی ہوئی قوم کے لیے پیام اجل تھا جس نے قومی حیثیت سے اُن کا خاتمہ کر دیا۔

۳۹۔ یہ اُس قانون کے مطابق ہوا جو اللہ تعالیٰ نے قوموں کے عزل و نصب کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ جو قومیں علم و اخلاق کے لحاظ سے پستی میں گر جاتیں اور خدا کی نعمتیں پا کر اُن پر شکر گزار ہونے کے بجائے سرکشی اختیار کر لیتی ہیں، اُنھیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہلاکت بالعموم تدریجاً ہوتی ہے۔ تاہم بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ارضی یا سماوی آفت آکر تباہی کو آخری انجام تک پہنچا دیتی ہے۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم سبا کے ساتھ یہی معاملہ ہوا اور اِس سیلاب کے نتیجے میں وہ ایسے تتر بتر ہوئے کہ سبا نام کی کوئی قوم دنیا میں باقی نہیں رہی اور اُس کی پراگندگی ضرب المثل ہو گئی۔ اہل عرب آج بھی اگر کسی گروہ کے اِس طرح منتشر ہو جانے کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ 'تفرقوا أيدي سبا' (وہ ایسے پراگندہ ہوئے، جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی)۔ یہ، ظاہر ہے کہ عذاب کی وہ صورت نہیں ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قوموں پر آتا ہے۔

* المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۲/ ۲۸۳۔

وَجَعَلۡنَا بَیۡنَھُمۡ وَبَیۡنَ الۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡھَا قُرًی ظَاھِرَۃً وَّقَدَّرۡنَا فِیۡھَا
السَّیۡرَ ؕ سِیۡرُوۡا فِیۡھَا لَیَالِیَ وَاَیَّامًا اٰمِنِیۡنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوۡا رَبَّنَا بٰعِدۡ بَیۡنَ اَسۡفَارِنَا
وَظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَھُمۡ فَجَعَلۡنٰھُمۡ اَحَادِیۡثَ وَمَزَّقۡنٰھُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ

ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان، جہاں ہم نے برکتیں رکھی تھیں، [۴۰] ایسی بستیاں آباد کیں جو سامنے راستے پر تھیں [۴۱] اور اُن کے اندر (اُن کے لیے) سفر کی منزلیں ٹھیرادیں [۴۲] کہ اُن میں دن رات بے خوف و خطر سفر کرو۔ [۴۳] مگر اُنھوں نے (جو رویہ اختیار کیا تو گویا زبان حال سے) کہہ دیا کہ پروردگار، ہماری منزلوں کو دور دور کر دے۔ [۴۴] اور اِس طرح اپنی جانوں پر ظلم کیا

۴۰۔ یہ اشارہ شام و فلسطین کی طرف ہے جن کے ساتھ اہل سبا کے تجارتی تعلقات تھے۔ اِن کے لیے 'بٰرَکۡنَا فِیۡھَا' کی صفت آیت میں اِس لیے آئی ہے کہ یہ علاقہ نہایت زرخیز تھا۔

۴۱۔ یعنی گوشوں میں چھپی ہوئی نہیں تھی، بلکہ اُسی شاہ راہ پر تھیں، جہاں سے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔

۴۲۔ یعنی ایسے مناسب فاصلوں پر واقع تھیں گویا سفر کرنے والوں کے لیے قدرت نے ٹھیرنے اور پڑاؤ کرنے کی منزلیں بنادی ہوں۔

۴۳۔ مطلب یہ ہے کہ اِس علاقے میں سفر ایک قسم کی خوش گوار سیر بن گیا تھا۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا قدرت نے یہ اہتمام کر کے ہر منزل پر یہ کتبہ لگا دیا کہ تمھاری خاطر یہ اہتمام ہم نے اِس لیے کیا ہے کہ تم راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی بے خوف و خطر سفر کر سکو۔ اِس کے بعد اتنی بات حذف ہے کہ 'اور اپنے رب کا شکر ادا کرو'۔ اِس کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر نعمت کا فطری تقاضا ہے، اِس کو لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان جو کچھ اپنے علم و عقل سے کرتا ہے، وہ بھی درحقیقت خدا ہی کی عنایت ہوتی ہے، لیکن اپنی بے بصیرتی کے باعث وہ اُس کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔

۴۴۔ یعنی اِس سیر گاہ کو ویرانے میں بدل دے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"یہ اُن کے زبان قال کی نہیں، بلکہ زبان حال کی تعبیر ہے کہ اُنھوں نے یہ رفاہیتیں پا کر رویہ جو اختیار کیا،

لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿۱۹﴾

تو ہم نے بالآخر اُنھیں افسانہ بنا دیا[۴۵] اور اُن کو بالکل تتر بتر کر ڈالا۔[۴۶] یقیناً اِس میں ہر اُس شخص کے لیے نشانیاں ہیں جو صبر کرنے والا اور شکر کرنے والا ہو۔[۴۷] ۱۸-۱۹

اُس سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ اِن آسایشوں کے حق دار نہیں ہیں، بلکہ اِس بات کے سزاوار ہیں کہ اُن کی بستیاں ویران ہو جائیں، اُن کی منزلیں کٹھن ہو جائیں اور اُن کی یہ ساری رفاہیتیں اُن سے چھین لی جائیں۔ زبان حال کی تعبیرات کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کی نظیریں پیچھے گزر چکی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ اصل شہادت زبان حال ہی کی ہوتی ہے، نہ کہ زبان قول کی۔ یہود کا قول 'سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا' بھی اُن کے حال ہی کی تعبیر ہے۔" (تدبر قرآن ۶/ ۳۱۰)

۴۵۔ یعنی حال کے صفحے سے مٹا کر ماضی کا ایک قصۂ پارینہ بنا دیے گئے۔

۴۶۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ غسانیوں نے اردن اور شام کا رخ کیا، اوس و خزرج نے یثرب کو اپنا مسکن بنایا، خزاعہ جدے کے قریب تہامہ کے علاقے میں جا بسے، ازد کے لوگ عمان میں جا کر آباد ہو گئے، لخم اور جذام اور کندہ بھی جہاں سینگ سمایا، نکل گئے۔ حتیٰ کہ سبا اور قوم سبا کا نام ہی باقی رہ گیا۔

۴۷۔ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ ہر نعمت در حقیقت خدا کا فضل اور اُس کی عنایت ہے۔ اِس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کا شکر ادا کیا جائے، اِس لیے کہ یہ سب کچھ اُس نے امتحان کے لیے دیا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ اُس کے بندے اِن نعمتوں کو پا کر شکر گزار ہوتے ہیں یا ناشکری اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اِس امتحان کا نتیجہ بھی ایک دن لازماً نکلنا ہے، قوموں کے لیے اِسی دنیا میں اور افراد کے لیے قیامت میں، جب ہر شخص کو جزا و سزا کے لیے اٹھایا جائے گا۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس سرگذشت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اہل سبا کی سرگذشت یہاں دو مرتبہ دہرائی گئی ہے اور دونوں مرتبہ اُن کے عبرت انگیز انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پہلے اُن کے علاقے کی زرخیزی و شادابی کے ذکر کے بعد اُن کی ناشکری اور اُس کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا، پھر اُن کی تمدنی و تجارتی ترقیوں کے ذکر کے بعد اُن کے کفران نعمت کے نتیجے میں اُن کے انتشار کی طرف۔ یہ اسلوب بیان اِس لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل مقصود

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾
وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا
فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾

اِس میں کیا شبہ ہے کہ اُن پر ابلیس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا۔[48] سو وہ اُسی کے راستے پر چلے، ایمان والوں کے ایک گروہ قلیل کے سوا۔[49] حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کو اُن پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ ہم نے یہ مہلت اُس کو دی تو صرف اِس لیے کہ ہم اُن لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اُن لوگوں سے الگ معلوم کر لیں جو اُس کی طرف سے[50] شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور تیرا پروردگار، (اے پیغمبر)، ہر چیز پر نگران ہے۔[51] ۲۰-۲۱

جس کے لیے یہ سرگذشت سنائی جا رہی ہے، نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ قرآن میں اِس اسلوب بیان کی متعدد نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۳۱۰)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۴۸۔ یہ ابلیس کے اُس گمان کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار اُس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دینے کے بعد کیا تھا۔ قرآن نے اِسے سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۷ میں نقل فرمایا ہے۔

۴۹۔ یہ گروہ قلیل ترین ہو سکتا ہے، لیکن دنیا کی کوئی قوم اِس سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اِس کا مشاہدہ رفتہ و حاضر کی ہر قوم کے حالات میں کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے لیے کسی تاریخی حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ قوموں پر زوال آجائے تو اِس کے نتائج اِس گروہ کو بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ قرآن نے اِسی کے متعلق فرمایا ہے کہ اُس فتنے سے بچو جس میں صرف ظالم ہی مبتلا نہیں کیے جائیں گے۔*

۵۰۔ یعنی آخرت کی طرف سے۔

۵۱۔ یعنی ابلیس کو مہلت دے کر خدا نے دنیا اُس کے حوالے نہیں کر دی ہے، بلکہ وہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ نہ ابلیس کو اجازت دیتا ہے کہ اپنے حدود سے تجاوز کرے اور نہ انسان کو اپنی مدد سے محروم رکھتا ہے، اگر وہ صحیح رویہ اختیار کرے۔

[باقی]

* الانفال ۸: ۲۵۔

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز

لڑکپن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ[1]: لَمَّا بُنِيَتِ الكَعْبَةُ، ذَهَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَبَّاسٌ يَنْقُلاَنِ الحِجَارَةَ، فَقَالَ عَبَّاسٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اجْعَلْ إِزَارَكَ عَلَى رَقَبَتِكَ[2] يَقِيكَ مِنَ الحِجَارَةِ، [ففعل[3]]، فَخَرَّ إِلَى الأَرْضِ[4] وَطَمَحَتْ عَيْنَاهُ إِلَى السَّمَاءِ، ثُمَّ أَفَاقَ، فَقَالَ: «إِزَارِي إِزَارِي فَشَدَّ عَلَيْهِ إِزَارَهُ».

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں: جب کعبہ کی تعمیر نو کی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے لیے پتھر ڈھونے لگے اور (آپ کے ساتھ آپ کے چچا) عباس رضی اللہ عنہ بھی۔ (یہ آپ کے لڑکپن کا زمانہ تھا)، چنانچہ عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: اپنا تہ بند اتار کر گردن پر رکھ لو، یہ تمھیں پتھروں سے محفوظ رکھے گا۔ آپ نے ایسا ہی کیا، مگر فوراً ہی زمین پر گر پڑے اور نظریں آسمان پر گڑ کر رہ گئیں۔ پھر جب ہوش آیا تو کہنے لگے: میرا تہ بند! میرا تہ بند! یہ دیکھ کر آپ کے چچا نے آپ کا تہ بند آپ پر اچھی طرح باندھ دیا۔[1]

۱۔ نبیوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ 'خیار الناس' ہوتے ہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے جو لڑکپن میں بھی اِس طریقے سے ظاہر ہوئی۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن اصلاً صحیح بخاری، رقم ۳۸۲۹ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے تنہا راوی جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اِس کے متابعات اِن مصادر میں دیکھے جا سکتے ہیں:

مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۱۰۳۔ مسند احمد، رقم ۱۴۱۴۰، ۱۴۳۳۲، ۱۵۰۶۸۔ صحیح بخاری، رقم ۳۶۴، ۱۵۸۲۔ صحیح مسلم، رقم ۳۴۰۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۲۲۴۳۔ حدیث السراج، رقم ۶۰۶۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۸۰۲، ۸۰۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۶۰۳، ۷۰۵۱۔ مستخرج ابی نعیم، رقم ۷۶۶، ۷۶۷۔ دلائل النبوۃ، ابی نعیم، رقم ۱۳۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۳۲۲۵۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۳۲/۲۔

۲۔ بعض روایات، مثلاً صحیح بخاری، رقم ۳۶۴ میں یہاں 'مَنْكِبَيْكَ'، ''تمھارے کاندھے'' کے الفاظ ہیں، اور بعض روایات، مثلاً صحیح مسلم، رقم ۳۴۰ میں اِس جگہ اسی کے ہم معنی 'عَاتِقَكَ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۳۔ صحیح مسلم، رقم ۳۴۰۔ بعض روایات، مثلاً مسند ابی یعلیٰ، رقم ۲۲۴۳ میں یہاں 'فَحَلَّهُ فَجَعَلَهُ عَلٰى مَنْكِبِهِ'، ''چنانچہ آپ نے اُسے کھولا اور اپنے کاندھے پر رکھ لیا'' کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۴۔ بعض روایات، مثلاً صحیح بخاری، رقم ۳۶۴ میں یہاں 'سَقَطَ مَغْشِيًّا عَلَيْهِ'، ''غش کھا کر گر پڑے'' کے الفاظ مروی ہیں اور اِس کے فوراً بعد 'فَمَا رُئِيَ بَعْدَ ذٰلِكَ عُرْيَانًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'، ''چنانچہ اُس دن کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی عریاں نہیں دیکھا گیا'' کے الفاظ منقول ہیں۔

المصادر والمراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (۱٤۲۷هـ/۲۰۰٦ م). **العلل**. ط ۱. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (١٢٧١هـ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط ١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن أبي عاصم أبو بكر بن أحمد الشيباني. (٢٠١٥م). **الأوائل لابن أبي عاصم**. المحقق: محمد بن ناصر العجمي. الكويت: دار الخلفاء للكتاب الإسلامي.

إبن حبان أبو حاتم محمد البُستي. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠هـ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعارف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط ١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: لبنان. مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د. عاصم بن عبد الله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن سعد أبو عبد الله محمد. (١٤٠٨هـ). **الطبقات الكبرى**. ط ٢.تحقيق: زياد محمد منصور. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

ابن عدي عبد الله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط ١.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبد القيوم عبد رب النبي. مكة مكرمة: المكتبة الإمدادية.

ابن المِبْرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط ١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩هـ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط ١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

أبو اسحٰق الحويني. (١٤٣٣هـ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط ١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السِّجِسْتاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو عوانة يعقوب بن إسحٰق. (١٤١٩هـ/١٩٩٨م). **المستخرج**. ط١. تحقيق: أيمن بن عارف الدمشقي.بيروت: دار المعرفة.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **دلائل النبوة**. ط٢. تحقيق: الدكتور محمد رواس قلعه جي، وعبد البر عباس. بيروت: دار النفائس.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهانى. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **المسند المستخرج على صحيح مسلم**. ط١. تحقيق: محمد حسن إسمٰعيل الشافعي. بيروت:دار الكتب العلمية.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **دلائل النبوة**. ط٢. تحقيق: الدكتور محمد رواس قلعه جي، وعبد البر عباس. بيروت: دار النفائس.

أبو يعلى أحمد بن علي التميمي. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **المسند**. ط١. تحقيق: حسين سليم أسد. دمشق: دار المأمون للتراث.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢١هـ/٢٠٠١م). **المسند**. ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط، وعادل مرشد، وآخرون. بيروت: مؤسسة الرسالة.

إسحٰق بن راهويه الحنظلي. (١٤١٢هـ/١٩٩١م). **المسند**. ط١. تحقيق: د. عبد الغفور بن عبد الحق البلوشي. المدينة المنورة: مكتبة الإيمان.

البخاري أبو عبد الله محمد بن إسمٰعيل. (١٤٢٢هـ). **الجامع الصحيح**. ط١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت: دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧هـ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط ١. حلب. القاهرة: دار الوعي مكتبة دار التراث.

البيهقي أبو بكر أحمد بن الحسين. (١٤١٢هـ/١٩٩١م). **الآداب**. ط١. تحقيق: ابو عبد الله السعيد المندوه. بيروت: مؤسسة الكتب الثقافية.

البيهقي أبو بكر أحمد بن الحسين. (١٤٠٥هـ). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١. بيروت: دار الكتب العلمية.

البيهقي أبو بكر أحمد بن الحسين. (١٤٢٤هـ/٢٠٠٣م). **السنن الكبرى**. ط٣. تحقيق: عبد المعطي أمين قلعه جي. بيروت: دار الكتب العلمية.

الحاكم أبو عبد الله محمد بن عبد الله. (١٤١١هـ/١٩٩٠م). **المستدرك على الصحيحين**. ط١.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تحقیق:مصطفى عبد القادر عطا. بيروت: دار الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط١. تحقيق و تخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض: دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الانصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة: دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحيى شفيق حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت: عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

السَّرَّاج محمد بن إسحٰق النيسابوري. (١٤٢٥هـ/٢٠٠٤م). **حديث السراج**. ط١. تحقيق: أبو عبد الله حسين بن عكاشة. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

الطبراني أبو القاسم سليمان بن أحمد. (١٤١٥هـ/١٩٩٤م). **المعجم الكبير**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي. القاهرة: مكتبة ابن تيمية.

عبد الرزاق أبو بكر بن همام الصنعاني. (١٤٠٣هـ). **المصنف**. ط ٢. تحقيق: حبيب الرحمٰن الأعظمي. الهند: المجلس العلمي.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط ١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البستوي. المدينة المنورة: مكتبة الدار.

مسلم بن الحجاج أبو الحسين النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د.ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢ھ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

نور الدين علي بن أبي بكر. (١٣٩٩ھ/١٩٧٩م). **كشف الأستار عن زوائد البزار**. ط١. تحقيق: حبيب الرحمٰن الأعظمي. بيروت: الناشر: مؤسسة الرسالة.

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

”میزان“ — توضیحی مطالعہ

حدود و تعزیرات

(۱)

حدود کی نوعیت

”انسانی تاریخ میں اِس فساد کا سب سے پہلا ظہور ابو البشر آدم کے بیٹے قابیل کے ہاتھ سے ہوا، لہٰذا یہ ضرورت اِس کے ساتھ ہی سامنے آگئی کہ انسان کو خود انسان کے شر و فساد سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ جرم و سزا کے تمام ضابطے اِسی ضرورت سے وضع کیے گئے ہیں۔ اِن میں اصلی مقصود شر و فساد کا استیصال ہی ہوتا ہے اور وہی ہونا چاہیے، لیکن جو لوگ خدا کی ہدایت قبول کر کے اُس کے رسولوں پر ایمان لے آئیں، اُن کا معاملہ عام مجرموں کا نہیں ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگر جان، مال، آبرو یا نظم اجتماعی کے خلاف کسی بڑے جرم کا ارتکاب کریں تو خدا کا فیصلہ ہے کہ اُن کو اِسی دنیا میں عذاب دیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ خدا کی اِس عقوبت کو دیکھ کر آخرت کے عذاب کی یاددہانی حاصل کریں۔“

(میزان ۶۱۱)

مصنف نے یہاں حدود کی جو نوعیت واضح کی ہے، اس میں بہت اہم نکتے مضمر ہیں، جن میں سے بعض کی تفصیل و توضیح مصنف نے دوسرے مقامات پر کی ہے۔

پہلا نکتہ حدود کی مشروعیت کے بنیادی پہلو سے متعلق ہے۔ فقہا عموماً حدود کو زواجر قرار دیتے ہیں، جس کا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مطلب یہ ہے کہ یہ سزائیں شریعت میں بنیادی طور پر جرائم کی روک تھام کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ علامہ ابن الہمام نے اس نکتے کو یوں بیان کیا ہے کہ شریعت میں جو بھی سزا مشروع کی گئی ہے، وہ درحقیقت اس دنیا میں مقصود چند مصالح کے لیے کی گئی ہے، مثلاً قصاص کو جانوں کی، حد قذف کو آبرو کی، حد شرب کو عقل کی، حد زنا کو نسب کی اور حد سرقہ کو مال کی حفاظت کے لیے مشروع کیا گیا ہے (فتح القدیر ۶/ ۷۲)۔

مصنف کا نقطۂ نظر اس ضمن میں یہ ہے کہ جرم و سزا کے عام ضابطوں میں تو یقیناً اصل مقصد جرائم کی روک تھام اور فساد کا سد باب ہوتا ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی شریعت میں یہ مقصد ثانوی اور ضمنی ہو جاتا ہے، جب کہ خدا کی مقرر کردہ سزاوں کا اصل مقصد خدا پر ایمان لانے کے بعد اس کے مقرر کردہ حدود کو پامال کرنے والوں کو خدا کی طرف سے عذاب کا مزہ چکھانا اور انھیں آخرت کی عذاب کی یاد دہانی کرانا ہوتا ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۳۸ میں 'جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ' کی تفسیر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

> ''یعنی یہ پاداش عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامان عبرت بھی کہ وہ اِس سزا کو دیکھ کر جان لیں کہ جس خدا کی عقوبت دنیا میں یہ ہے، وہ آخرت میں اپنے نافرمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ دنیا کی حرص میں اپنی آخرت برباد نہ کریں۔ سزا کا اصلی مقصد یہی ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس طرح کی سزائیں کسی معاشرے میں نافذ ہوں تو اِس سے جرائم کی روک تھام میں مدد ملتی ہے۔ یہ ایک ضمنی فائدہ ہے، اِس کو بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔'' (میزان ۶۳۰)

دوسرا نکتہ ان سزاؤں کے نفاذ و اجرا سے متعلق ہے۔ مصنف کی رائے میں ان سزاؤں کا بنیادی مقصد چونکہ استیصال جرم نہیں، بلکہ یہ اللہ اور رسول پر ایمان لے آنے کے بعد اس کے حدود کو پامال کرنے پر خدا کی طرف سے عقوبت اور عذاب کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے ان کا نفاذ بھی انھی مجرموں پر کیا جائے گا جو مسلمان ہوں، غیر مسلم نہ ہوں۔

ابن حزم اور حنفی فقہا کی رائے اس سے مختلف ہے اور وہ اسلامی ریاست کے دیگر عمومی قوانین کی طرح غیر مسلموں پر شرعی حدود کو بھی قابل تنفیذ قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ابن حزم کا استدلال کلامی نوعیت کا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ شریعت کے احکام پر عمل کے مکلف تمام انسان ہیں، یعنی جیسے مسلمان ان کے مخاطب ہیں، ویسے ہی غیر مسلم بھی ہیں۔ اس کے برخلاف حنفی فقہا اس حوالے سے اسلامی ریاست کے ساتھ غیر مسلموں کے

سیاسی معاہدے سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ان کے نقطۂ نظر سے یہ بات مضمر ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے خاص مذہبی اور نجی معاملات میں تو مذہبی آزادی حاصل ہو گی، لیکن ریاست کے عمومی قوانین میں وہ اسلامی شریعت کی پابندی قبول کریں گے۔

مصنف کی رائے اس بحث میں ان اہل علم کے موقف کے مطابق ہے جو غیر مسلموں پر حدود کے نفاذ کو لازم نہیں سمجھتے۔ یہ رائے صحابہ وتابعین میں سے سیدنا علی، عبد اللہ بن عباس، عمر بن عبد العزیز، ابراہیم نخعی، شعبی، ربیعۃ الرائے، عطاء اور حسن بصری سے منقول ہے اور امام ترمذی نے اس کو اکثر اہل علم کی رائے کے طور پر بیان کیا ہے۔*

حدود اور اخروی سزا

''مجرموں کے لیے بھی یہ عذاب، اگر وہ توبہ اور اصلاح کا رویہ اختیار کریں تو گناہ سے تطہیر کا ذریعہ بن جائے۔'' (میزان ۶۱۱)

''چور کے لیے یہ محض دنیوی سزا ہے۔ رہی آخرت تو اُس میں نجات توبہ اور اصلاح ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہ دنیوی سزا نہ توبہ کا بدل ہے اور نہ توبہ اِس کے لیے بدل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ توبہ واصلاح کے باوجود حکومت یہ سزا لازماً نافذ کرے گی اور دنیا میں یہ سزا پا لینے کے باوجود آخرت کا معاملہ توبہ اور اصلاح ہی سے درست ہو گا جس کے ساتھ البتہ، توقع ہے کہ یہ مجرم کے لیے اُس کے گناہ سے تطہیر کا ذریعہ بن جائے گی۔''

(میزان ۶۳۱)

اہل علم کے مابین اس حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان سزاؤں کا نفاذ مجرم کو اخروی سزا سے بچا لیتا ہے یا وہ اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ بعض حنفیہ سے منقول ہے کہ حدود، اخروی سزا کا بدل نہیں بنتے، جب کہ جمہور محدثین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث کی روشنی میں حدود کو کفارہ قرار دیتے ہیں، جس کے بعد آخرت میں دوبارہ مجرم کا مواخذہ نہیں ہو گا (بخاری، رقم ۱۸)۔ تاہم سیدنا ابوہریرہ کی ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ حدود کفارہ بن جاتے ہیں یا نہیں (المستدرک للحاکم، رقم ۳۶۱۱)۔ ابن حجر اور دیگر شارحین ان کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حدود کا اخروی حکم ابتدا میں

* اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب: حدود و تعزیرات: چند اہم مباحث ۲۹۵-۲۹۶۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

واضح نہیں تھا، اس لیے آپ نے ان کے کفارہ ہونے کے متعلق تردد ظاہر فرمایا، لیکن پھر بعد میں آپ کو بتادیا گیا کہ حدود کفارہ بن جاتے ہیں (فتح الباری ۶۶/۱)۔

عہد نبوی میں بعض مجرموں پر حدود کے نفاذ کے واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر سزا کے ساتھ مجرم نے مخلصانہ طور پر گناہ سے توبہ بھی کر لی ہو اور اس جذبے کے ساتھ خود کو نفاذ حد کے لیے پیش کیا ہو کہ وہ گناہ سے پاک ہو جائے تو پھر اس کی سزا لازماً اخروی مغفرت کی ضامن بن جاتی ہے۔ چنانچہ قبیلۂ بنو غامد کی خاتون کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اہل مدینہ میں سے ستر لوگوں کے مابین تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو گی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا اس سے بہتر کوئی توبہ ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی جان کو قربان کر دیا؟ (مسلم، رقم ۱۶۹۶)۔

البتہ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا دنیا میں صرف حد کا نافذ ہو جانا کفارہ بننے کے لیے کافی ہے یا اس کے ساتھ مجرم کی طرف سے توبہ واصلاح بھی شامل حال ہونی چاہیے؟ بہت سے اہل علم اس کے لیے توبہ کو شرط قرار نہیں دیتے، جب کہ دیگر اہل علم کے نزدیک توبہ کا پایا جانا کفارہ بننے کے لیے ناگزیر ہے (فتح الباری ۶۸/۱۔ عقیدة السفاريني ۳۲۰/۱ بحوالہ ہامش فیض الباری)۔ علامہ انور شاہ کشمیری توبہ کے لازم ہونے کے قائل ہیں اور اس حوالے سے اپنی تحقیق کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر مجرم سزا کے ساتھ باقاعدہ توبہ کر لے تو اس کی سزا بلا اختلاف کفارہ بن جائے گی۔ اسی طرح اگر وہ باقاعدہ توبہ نہ کرے، لیکن سزا کے بعد آیندہ کے لیے عملاً گناہ سے دور رہے تو بھی سزا اس کے لیے کفارہ بن جائے گی۔ تاہم اگر وہ توبہ بھی نہ کرے اور گناہ سے عملاً بھی اجتناب نہ کرے، بلکہ بار بار ارتکاب کرتا رہے تو پھر اس کی سزا کفارہ نہیں بنے گی۔ مزید لکھتے ہیں کہ عہد نبوی میں چونکہ جن افراد پر حدود کیے جاتے تھے، وہ عموماً توبہ اور اصلاح بھی کر لیتے تھے اور اس کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی صاحب ایمان سزا پانے کے باوجود توبہ اور اصلاح نہ کرے، اس لیے حدیث میں اس پہلو سے حدود کے نفاذ کو مطلقاً کفارہ قرار دیا گیا ہے، ورنہ اصولاً اس میں توبہ کی شرط بھی مضمر ہے (فیض الباری ۱۶۷/۱)۔

مصنف کا نقطۂ نظر اس بحث میں ان اہل علم کے قریب تر دکھائی دیتا ہے جو مجرم کی توبہ اور اصلاح کے ساتھ حدود کے کفارہ بن جانے کے قائل ہیں۔

حدود کا ناقابل تغییر ہونا

"شریعت میں جن جرائم کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ یہی ہیں۔ اِن کی ادنیٰ صورتوں اور اِن کے علاوہ باقی

سب جرائم کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد پر چھوڑ دیا ہے۔‘‘(میزان ۶۱۲)

مصنف کے بیان سے واضح ہے کہ جن جرائم کی سزائیں شریعت میں بطور حد مقرر کی گئی ہیں، ان میں ترمیم و تغییر کا اجتہادی اختیار امت کو حاصل نہیں ہے اور ان کی جگہ سزا کی متبادل صورتیں اختیار کر لینے کی گنجایش بھی شریعت میں نہیں رکھی گئی۔ سورۂ نور کی ابتدا میں ’اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا‘ کی تفسیر میں مصنف نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ’’البیان‘‘ میں لکھا ہے:

’’یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِسی نوعیت کے احکام تھے جو پچھلی امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئے اور اُنھوں نے اُن سے گریز وفرار کے راستے تلاش کرنا چاہے۔ چنانچہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ سفارشات نہیں ہیں، بلکہ خدا کے عائد کردہ فرائض اور اُس کے قطعی احکام ہیں جن کی ہر جگہ اور ہر زمانے میں بے چون وچرا تعمیل ہونی چاہیے۔ اِن میں کسی کے لیے بے پروائی یا سہل انگاری کی گنجایش نہیں ہے۔‘‘(۴۱۵/۳)

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۳ (وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ) میں اللہ تعالیٰ نے علماے یہود پر یہ تنقید کی ہے کہ وہ اپنے پاس تورات کے موجود ہوتے ہوئے کسی معاملے میں فیصلے کرانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیونکر رجوع کر سکتے ہیں؟ مصنف نے اس سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ:

’’اِس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون اگر قانون کی حیثیت سے دیا گیا ہے تو اُس پر عمل بجاے خود مطلوب ہوتا ہے۔ اُس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر کوئی شخص اُس کی جگہ کوئی دوسرا قانون نہیں بنا سکتا۔ آیت میں دیکھ لیجیے، نزول تورات کے کم و بیش دو ہزار سال بعد بھی اللہ تعالیٰ کا اصرار ہے کہ اُس کے ماننے والے اُس کے احکام کے پابند ہیں۔ اِس کے بعد کسی مسلمان کے لیے یہ بات کس طرح جائز ہو سکتی ہے کہ اللہ کے قانون کو ایک طرف رکھ کر وہ اُس کے مقاصد کی رعایت سے اپنے لیے خود کوئی قانون بنا لے؟ آیت کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہ حدود ہی کے احکام تھے جن سے فرار کے لیے یہود نے مختلف قسم کے حیلے نکالنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ یہ صرف ظالم، فاسق اور کافر ہی ہیں جو اُس کے احکام سے اِس طرح فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔‘‘(البیان ۱/ ۶۲۳)

یہ فقہا کا متفقہ موقف ہے اور فقہی روایت میں اس کو بالعموم یوں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں حق اللہ ہیں جنھیں معاف کرنے یا تبدیل کرنے کا حق مسلمانوں کو نہیں ہے اور وہ اللہ کے ایک حق کے طور پر انھیں مجرموں پر نافذ کرنے کے پابند ہیں۔ البتہ مصنف نے حدود کے ناقابل تبدیل ہونے کی توضیح میں ان کے عذاب الٰہی

ہونے کے پہلو کو نمایاں کیا ہے جو حق اللہ کی روایتی فقہی تعبیر میں اس طرح نمایاں نہیں ہے۔

حدود کے نفاذ کے اخلاقی اصول

”اِن سزاؤں کا مقصد محض جرم کا استیصال نہیں، بلکہ اُن سب لوگوں کو خدا کے عذاب کا مزہ چکھانا اور دوسروں کے لیے عبرت بنا دینا بھی ہے جنھوں نے پورے شعور کے ساتھ اپنے آپ کو خدا اور اُس کے رسولوں کے حوالے کیا، اُن سے عہد اطاعت باندھا، اُن کے دین کو دین کی حیثیت سے قبول کیا اور اِس کے بعد اِس نوعیت کے بڑے جرائم میں اِس حد تک ملوث ہو گئے کہ خدا نے اُن کا پردہ فاش کر دیا اور معاملات عدالت تک پہنچ گئے۔“(میزان ۶۱۱)

”یہ سزا بھی اِس جرم کی انتہائی سزا ہے اور صرف اُنھی مجرموں کو دی جائے گی جن سے جرم بالکل آخری صورت میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔ چنانچہ سزا کے تحمل سے معذور، مجبور اور جرم سے بچنے کے لیے ضروری ماحول، حالات اور حفاظت سے محروم سب لوگ اِس سے یقیناً مستثنیٰ ہیں۔“(میزان ۶۲۷)

مصنف نے ان اقتباسات میں انتہائی سزا کے نفاذ سے مختلف طرح کے مجرموں کو مستثنیٰ قرار دینے کے کچھ بنیادی اصول بیان کیے ہیں۔

پہلے اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف کے نزدیک حدود کا نفاذ انھی مسلمانوں پر ہونا چاہیے جنھوں نے پورے شعور سے ایمان کو اختیار کیا اور خدا کے حکموں کی پابندی قبول کی ہو۔ اس شرط کی بنائے استدلال مصنف نے ایک دوسری تحریر میں یوں واضح کی ہے:

”زنا اور چوری کی جو سزائیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں، وہ اِن جرائم کی انتہائی سزائیں ہیں اور صرف اُنھی مجرموں کو دی جائیں گی جن سے جرم بالکل آخری درجے میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔ اِن میں اہم ترین چیز اُن کا دینی شعور ہے۔ یہ سزائیں اُن لوگوں کے لیے نہیں ہیں جو غیر مسلم ہیں یا پیدایشی لحاظ سے مسلمان تو ہیں، مگر دینی شعور کے لحاظ سے غیر مسلموں ہی کے حکم میں ہیں۔ اِس لیے کہ اِن سزاؤں سے مقصود محض جرم کا استیصال نہیں ہے، بلکہ اُن مجرموں کو خدا کے عذاب کا مزہ چکھانا اور دوسروں کے لیے عبرت بنا دینا بھی ہے جنھوں نے پورے شعور کے ساتھ اپنے آپ کو خدا اور اُس کے رسول کے حوالے کیا، اُن سے عہد اطاعت باندھا، اُن کے دین کو دین کی حیثیت سے قبول کیا اور اِس کے بعد

چوری اور زنا جیسے جرائم میں اِس حد تک ملوث ہو گئے کہ خدا نے اُن کا پردہ فاش کر دیا اور معاملات عدالت تک پہنچ گئے۔‘‘(مقامات ۲۳۳)

گویا مصنف کے نزدیک جس طرح ضروری دینی و اخلاقی تربیت سے محروم مجرموں کو حدود کے نفاذ میں رعایت دی جاتی ہے، اسی طرح دینی و ایمانی شعور سے نابلد ایسے مسلمان بھی ان سزاؤں کے نفاذ کا محل نہیں ہیں جو مسلمان گھرانوں میں پیدا تو ہوئے ہیں اور اسلام کے ساتھ ایک پیدایشی نسبت بھی رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے اپنے ارادی فیصلے سے پورے شعور کے ساتھ ایمان اور اس کے مطالبات کو قبول نہیں کیا۔ غالباً مصنف کے پیش نظر، آج کی مسلمان نسلوں کے وہ افراد ہیں جو ذہنی طور پر تشکیک یا الحاد کا شکار ہیں اور خاص طور پر شرعی حدود سے متعلق دور جدید کے انسانی حقوق کے فلسفے سے متاثر ہیں، جو ان سزاؤں کو وحشیانہ اور غیر انسانی تصور کرتا ہے۔ مصنف کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ ظاہری طور پر مسلمانوں میں شمار کیے جانے کے باوجود، شرعی احکام اور پابندیوں کی تنفیذ کے پہلو سے ایسے مسلمانوں کو غیر مسلموں ہی کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔

دوسرے اقتباس میں انتہائی سزا سے استثنا کے کچھ مزید اہم اصولوں کا ذکر ہوا ہے۔

سزا کے تحمل سے معذور، مثلاً انتہائی بیمار یا ضعیف افراد کا استثنا ایک بدیہی عقلی اور اخلاقی اصول پر مبنی ہے، جس کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ نے بدکاری کی مرتکب ایک حاملہ عورت کو اس وقت تک رجم نہیں کیا جب تک وہ بچے کی ولادت سے فارغ نہیں ہو گئی (مسلم، رقم ۳۲۰۷)۔ اسی طرح سیدنا علی نے ایک لونڈی پر زنا کی سزا نافذ کرنے سے اس لیے گریز کیا کہ وہ بچے کی ولادت کے بعد ابھی حالت نفاس میں تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عمل کی تحسین فرمائی (مسلم، رقم ۳۲۱۷)۔ آپ نے ایک بوڑھے کو، جو کوڑوں کی سزا کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، حقیقی طور پر سو کوڑے لگوانے کے بجاے یہ حکم دیا کہ کھجور کے درخت کی ایک ٹہنی لے کر جس میں سو پتلی شاخیں ہوں، ایک ہی دفعہ اس کے جسم پر مار دی جائے (سنن ابی داؤد، رقم ۳۸۷۸)۔ سیدنا عمر کے پاس ایک شخص لایا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں چوری کے جرم میں پہلے ہی کاٹا جا چکا تھا۔ سیدنا عمر نے اس کا دوسرا پاؤں کاٹنے کا حکم دیا تو سیدنا علی نے کہا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں، کیونکہ اس کے پاس چلنے کے لیے ایک پاؤں اور اپنی ضروریات کے لیے ایک ہاتھ رہنا چاہیے (مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۸۷۶۶)۔

مجبور افراد کو سزا سے مستثنیٰ قرار دینے کے لیے مصنف نے سورۂ نور کی آیت ۳۳ سے استدلال کیا ہے،

جس میں ان باندیوں کو گناہ سے مبرا قرار دیا گیا ہے جن کے مالک ان کی رضامندی کے برخلاف انھیں زنا پر مجبور کریں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت کا مقدمہ پیش کیا گیا جس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک سفر کے دوران میں اس نے ایک چرواہے سے پینے کے لیے پانی مانگا تو اس نے اس شرط پر پانی دینے پر رضامندی ظاہر کی کہ خاتون اسے اپنے ساتھ زنا کرنے کی اجازت دے۔ چنانچہ خاتون نے شدید پیاس سے مجبور ہو کر اس کی شرط پوری کر کے اس سے پانی حاصل کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں صحابہ سے مشورہ کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس نے حالت اضطرار میں ایسا کیا ہے۔ چنانچہ اس خاتون کو کوئی سزا نہیں دی گئی (بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۸۲۷)۔

تیسرے استثنا کے لیے مصنف نے غلاموں اور باندیوں کے لیے زنا کی سزا نصف مقرر کیے جانے سے استدلال کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ غلام اور لونڈیاں، چونکہ خاندان کی حفاظت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے مناسب اخلاقی تربیت سے محروم تھیں اور انھیں اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے نکاح کا حق بھی آزاد لوگوں کی طرح حاصل نہیں تھا، اس لیے زنا میں ملوث ہونے کی صورت میں ان کے اس معاشرتی پس منظر کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لیے کم تر سزا تجویز کی گئی۔

احادیث اور صحابہ وتابعین کے آثار میں اس کے علاوہ بھی کئی اسباب کا ذکر ملتا ہے جو سزا میں تخفیف کا موجب ہو سکتے ہیں۔

مثلاً بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مجرم کسی فعل کی حرمت سے ناواقف ہو تو یہ چیز سرے سے سزا کے سقوط یا اس میں تخفیف کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ شام میں ایک شخص نے کسی جھجک کے بغیر لوگوں کے سامنے اپنے زنا کرنے کا ذکر کیا۔ لوگوں کی طرف سے ناگواری کے اظہار پر اس نے تعجب سے کہا کہ اچھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کہا ہے! میں تو اس بات سے واقف نہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عامل کو لکھا کہ اگر یہ شخص زنا کی حرمت سے واقف تھا تو اس پر حد قائم کرو، ورنہ اسے بتاؤ کہ یہ حرام ہے اور اگر دوبارہ اس کا مرتکب ہو تو پھر حد جاری کرو (مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۶۴۷)۔

اسی طرح حرمت محل میں واقع ہونے والے اشتباہ کی بنا پر سزا میں تخفیف کے نظائر بھی روایات و آثار میں موجود ہیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمے میں، جس میں شوہر نے اپنی بیوی کی لونڈی سے جماع کیا

تھا، یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر تو خاوند نے بیوی کی اجازت کے بغیر ایسا کیا ہے تو اسے رجم کیا جائے گا، لیکن اگر اس میں بیوی کی رضامندی شامل تھی تو خاوند کو صرف سو کوڑے لگائے جائیں گے (ترمذی، رقم ۱۴۵۱)۔ اسی نوعیت کے ایک دوسرے مقدمے میں آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر شوہر نے لونڈی کے ساتھ زبردستی جماع کیا ہے تو لونڈی آزاد ہے، لیکن اگر لونڈی رضامند تھی تو پھر وہ شوہر کی ملکیت قرار پائے گی اور دونوں صورتوں میں شوہر کے لیے لازم ہو گا کہ وہ اپنی بیوی کو اس جیسی کوئی دوسری لونڈی خرید کر دے (سنن ابی داؤد، رقم ۴۴۶۰)۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اطلاع

جناب جاوید احمد غامدی کے سمدھی اور جناب محمد حسن الیاس کے والد گرامی جناب محمد الیاس حیدری قضاے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

دعا ہے کہ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے اور اُن کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

—— ادارہ

محمد رضوان سلیم سندھو

ہمارا تخلیقی اور تحقیقی انحطاط: اسباب و تدارک

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

۱۔ وہ کیا وجوہات ہیں جو ایک معاشرے کو تخلیقی انحطاط میں مبتلا کر دیتی ہیں؟

۲۔ کسی معاشرے میں تخلیقی روایت کو مضبوط کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

۳۔ ایک فرد میں تخلیقی صلاحیت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے؟

۴۔ کیا مذہب جدت پسندی کی مخالفت کرتا ہے؟

۵۔ ہمارے ہاں کا عمومی معیار تحقیق پست کیوں ہے؟

۶۔ ہم اپنا معیار تحقیق کیسے بلند کر سکتے ہیں؟

ورچوئل یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر شعبوں کے ماہرین نے استاذ جاوید احمد صاحب غامدی کے ساتھ نومبر ۲۰۱۹ء میں درج بالا موضوع اور سوالات پر مشتمل ایک نشست میں تفصیلی گفتگو کی، جو ''دنیا'' ٹی وی پر دو اقساط میں نشر بھی کی گئی۔ ذیل کا مضمون اسی گفتگو سے ماخوذ ہے۔

ان باتوں میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں نکالی جا سکتی کہ انسان کی زندگی تجسس اور جستجو سے عبارت ہے۔ آج ہمارے اردگرد جتنے بھی شاہ کار ہیں، جتنی بھی ترقی انسانی تہذیب نے کی ہے، وہ تجسس اور جستجو کا حاصل ہے۔ انسان کو خدا نے جو بڑے بڑے انعامات دیے ہیں۔ ان میں تجسس اور جستجو غیر معمولی حیثیت کے حامل

ہیں۔ اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جان داروں میں سے صرف انسان کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ بے شمار دائروں میں تحقیق بھی کر سکتا ہے اور تخلیق بھی۔ تحقیق و تخلیق کے روح رواں تجسس اور جستجو ہیں۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ وہ اقوام جنھوں نے عظیم تہذیبیں پیدا کیں، وہ تحقیق و تخلیق میں دوسروں سے آگے تھیں۔ آج بھی جب ہم اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے: ایک طرف وہ اقوام اور تہذیبیں ہیں جو مادی اور اخلاقی طور پر دوسروں سے بہت آگے ہیں اور دوسری طرف وہ اقوام ہیں جو بہت پیچھے رہ گئی ہیں یا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اقوام کے ان دو گروہوں پر جب نگاہ ڈالی جاتی ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ایک، دوسرے سے آگے کیوں ہے؟ تو ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ جو تحقیق و تخلیق میں آگے ہیں، وہ ہر چیز میں آگے ہیں، اور جن کے ہاں یہ دونوں اوصاف انحطاط کا شکار ہیں، وہ خود بھی زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

وطن عزیز میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارا تعلق اقوام کے اس گروہ کے ساتھ ہے جو پیچھے رہ گیا ہے، اور بلاشبہ ہمارے ہاں تحقیق و تخلیق، دونوں انحطاط کا شکار ہیں۔ یہ تو وہ حقیقت ہے جو ہم سب جانتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ہمارے تحقیقی اور تخلیقی انحطاط کا سبب کیا ہے؟ اور بقول شاعر ''ایسے بیمار کی دوا کیا ہے'' (عصمتؔ)۔ شاید یہ وہ بات ہے جس پر ہمیں سب سے زیادہ غور بھی کرنا چاہیے اور اپنے عمل سے اس انحطاط سے نپٹنا بھی چاہیے۔

ہمارا یہ انحطاط اب اس قدر واضح ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کی شہادت موجود ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس انحطاط کے اسباب ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، البتہ ہم نے آنکھیں ضرور بند کر رکھی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ معاشرے جہاں تحقیق و تخلیق اعلیٰ معیار پر ہیں، وہ جبر، استبداد، اندھی تقلید، اظہار راے اور سوچ کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ وہاں کی حکومتیں اور ادارے شخصی آزادیوں پر قدغن لگانے سے حتی الامکان پرہیز کرتے ہیں۔

اگر اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے ہاں اس انحطاط کا سبب کیا ہے؟ تو بلاشبہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ پابندیاں لگانے کا ہمارا حد سے بڑھا ہوا شوق اس کی وجہ ہے۔ ویسے تو خدا کے فضل سے ہم ایک آزاد مملکت ہیں، مگر باقی ہر چیز پابندی کی زد میں ہے، وہ سوچ ہو، صلاحیت ہو، اظہار ہو، تحقیق ہو یا تخلیق۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر سطح پر، وہ معاشرہ ہو، ریاست ہو، حکومت ہو، خاندان ہو یا فرد، جبر روا رکھنا ایک روایت بن چکی ہے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تحقیق اور تخلیق آزادی مانگتے ہیں اور یہ آزادی معاشرہ دیتا ہے، جسے ریاست حکومت اور دوسرے اداروں کی مدد سے یقینی بناتی ہے۔ یہ بھی اہم سوال ہے کہ تحقیق اور تخلیق کا کوئی باہمی تعلق ہے جو

یہ ساتھ ساتھ آ رہی ہیں؟ ہاں، آپ غور کیجیے آئے روز یہ جو نت نئی ایجادات دست انسانی سے رونما ہو رہی ہیں یہ تخلیق کی مجسم شکلیں ہیں اور تحقیق کا نتیجہ۔

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ دنیا میں ہونے والی تحقیق و تخلیق میں ہمارا کتنا حصہ ہے؟ یہ پریشان کن بات ہے کہ ہمارا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری مٹی بانجھ ہے جو ایسے اہل علم و ہنر و فکر پیدا نہیں کر سکی جو تحقیق و تخلیق کر سکیں؟ نہیں، یہ سچ نہیں ہے، کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اعلیٰ اہل علم و ہنر و فکر تو پست ترین معاشروں میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو پھر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ اس ماحول کا نہ ہونا ہے جس میں تحقیق و تخلیق پنپ سکتی ہیں۔ وہ کیا ماحول ہوتا ہے جس میں یہ دونوں پنپ سکتی ہیں؟ وہ ایسا ماحول ہوتا ہے جس میں سوچنے پر، اظہار پر اور عمل پر صرف اس صورت میں پابندی ہوتی ہے جب وہ کسی کے جان، مال اور آبرو کے لیے نقصان دہ ہوں۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی آزادی بھی میسر آتی ہے اور سہولت بھی۔

دراصل کسی بھی ملک میں آزادی کا ایسا ماحول جو تحقیق اور تخلیق کے لیے درکار ہوتا ہے، اسے بنانے میں ریاست سے لے کر فرد تک سب اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ریاست، معاشرہ، خاندان، استاد اور فرد ہر روز ایک ایسا نیا سسٹم ایجاد کرتے ہیں کہ کہیں کوئی آزاد سوچ نہ پیدا ہو سکے، کہیں کسی نئی بات کا اظہار نہ کر سکے۔ ہمارے ہاں کے مدارس، وہ دینی تعلیم سے متعلق ہوں یا دنیاوی تعلیم سے، ان میں رائج نصاب اور موجود استاد اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ کوئی نئی سوچ نہ پیدا ہو جائے۔ عام طور پر ہماری درس گاہوں میں مختلف سوچنے والا استاد اور شاگرد، دونوں ہی زیر عتاب رہتے ہیں۔ استاد، نصاب اور انتظامیہ جن کا کام فرد کی عقل، اخلاق اور جمالیات کو فروغ دینا ہوتا ہے، وہ ان کے بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اس کو تجسس اور جستجو کی صلاحیت دی ہے تاکہ وہ آزادانہ تحقیق کر سکے اور تخلیق میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں معیار تحقیق اور تخلیق بلند ہو تو ہمیں ہر سطح پر اپنی سوچ اور عمل کو بدلنا ہو گا۔ ہمیں سوچ، فکر، ذکر اور اظہار کی آزادی کو یقینی بنانا ہو گا۔ ہمیں اپنے نظام تعلیم میں ایسی اصلاحات کرنی ہوں گی کہ ہمارے ہاں تقلید کے خوگر نہیں، بلکہ تحقیق کے دل دادہ پیدا ہوں۔ ہمیں معاشرے سے ہر قسم کے جبر و استبداد کو بتدریج کم کرنا ہو گا۔ ہمیں مختلف سوچ رکھنے والوں کو گوارا کرنا ہو گا، انھیں ایسا ماحول دینا ہو گا کہ وہ بلاخوف و خطر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ ہاں ہمیں یہ بھی یقینی بنانا ہو گا کہ کسی کی جان، مال اور آبرو کسی طرح بھی غیر محفوظ نہ ہو۔ ایسا انتظام

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بھی کرنا ہو گا کہ طالب علموں کی صلاحیتیں اجاگر ہوں اور ایسے اہل ہنر و فن و فکر جن کی صلاحیتیں ظاہر ہوں انھیں ریاست ہر طرح کی مالی و عملی سرپرستی فراہم کرے تاکہ وہ تحقیقی اور تخلیقی کام کر سکیں۔

ہم چونکہ ایک مذہبی معاشرہ ہیں، اس لیے اس سوال کا جواب بھی ضرور تلاش کرنا چاہیے کہ کیا مذہب تحقیق و تخلیق کی راہ میں رکاوٹ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب تو نہیں، البتہ مذہبی لوگ ضرور رکاوٹ ہو سکتے ہیں۔ یورپ جو آج دنیا میں مادی اور کسی حد تک اخلاقی ترقی کی بھی مثال ہے، ایک زمانے میں مذہبی لوگوں کے استبداد کا شکار تھا اور اس نے ترقی اس وقت شروع کی جب اس نے استبداد کا خاتمہ کر لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنی اصل میں الہامی مذاہب کبھی بھی تحقیق و تخلیق کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس آخری الہامی دین اسلام کی کتاب قرآن حکیم اپنی اصل حالت میں موجود ہے، اس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا نے غور و فکر اور سوچنے سمجھنے پر جتنا زور دیا ہے اتنا کسی اور چیز پر نہیں دیا۔ خدا اپنے بندوں کو غور و فکر اور تحقیق کی کھلی دعوت دیتا ہے۔ خدا کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور سنت کا مطالعہ بھی تحقیق و تخلیق کی تائید کرتا ہے۔ ہم اپنی دنیا کا بغور جائزہ لیں، جو خدا کی اعلیٰ تخلیق کا نمونہ ہے، تو یہ ہمیں ہر دم دعوت تحقیق اور تخلیق دے رہی ہے۔ دین کے ماخذ تو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہم لوگ تحقیق و تخلیق کریں، تو پھر ہمارے ہاں یہ انحطاط کیسا؟ اس کی وجہ لوگوں کا دین کو اس کے اصل سے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ جیسے ٹھیرے ہوے پانی میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے، ایسے ہی علم کا رکنا بھی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ تحقیق اگر سانچوں میں ڈھل جائے تو تخلیق رک جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۱۹)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت ہبار بن سفیان رضی اللہ عنہ

حضرت ہبار کا قبیلہ: بنو مخزوم

مخزوم بن یقظہ بنو مخزوم کے جد تھے۔ ان کی تیسری پشت پر کعب بن لؤی، آٹھویں پر قریش بن کنانہ اور تیرھویں پشت پر مضر بن نزار تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک وقت ایسا تھا کہ طاقت اور اثر ورسوخ میں بنو مخزوم بنوہاشم اور بنو امیہ کے برابر شمار ہوتے تھے۔ بنو مخزوم کی بیس سے زیادہ شاخیں ہوئیں، تاہم عمر بن مخزوم کے پوتے مغیرہ بن عبد اللہ کی اولاد کو زیادہ اہمیت ملی، مغیرہ ابوجہل کا دادا تھا۔ آمد اسلام کے بعد یہی خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن ثابت ہوا اور انھوں نے کم زور مسلمانوں پر تشدد کی انتہا کر دی۔

۶۱۶ء تا ۶۱۸ء: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان بنوہاشم کو شعب ابوطالب میں محصور کرانے میں ابوجہل نے اہم کردار ادا کیا۔ جنگ بدر میں اسلامی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے بنو مخزوم کے آٹھ کٹر کافر جہنم واصل ہوئے۔ اسی خاندان کے خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل نے جنگ احد میں مسلمانوں کو زبردست جانی نقصان پہنچایا۔ فتح مکہ سے پہلے حضرت خالد بن ولید ایمان لائے اور فتح کے بعد حضرت مہاجر بن ابوامیہ،

حضرت عکرمہ بن ابو جہل، حضرت حارث بن ہشام اور حضرت سعید بن یربوع کے مسلمان ہونے کے بعد پورا بنو مخزوم دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

بنو مخزوم کے مشاہیر

حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد، ام المومنین حضرت ام سلمہ، حضرت عیاش بن ابو ربیعہ، حضرت شماس بن عثمان، حضرت عبد اللہ بن سفیان، حضرت ہبار بن سفیان، حضرت ہشام بن ولید، حضرت خالد بن ولید، حضرت عکرمہ بن ابو جہل، حضرت حارث بن ہشام، حضرت سلمہ بن ہشام، حضرت مہاجر بن ابو امیہ، حضرت عبد اللہ بن ابو ربیعہ، ابو بکر بن عبد الرحمٰن اور سعید بن مسیب۔

حضرت خالد بن ولید کا باپ ولید بن مغیرہ قریش کا معزز اور صاحب ثروت سردار تھا، نوے برس سے زیادہ عمر پائی۔ اپنی سرداری کے زعم میں آخر دم تک ایمان نہ لایا۔

حضرت ہبار کا کنبہ

حضرت ہبار بن سفیان مخزومی مکہ میں پیدا ہوئے۔ عبد الاسد بن ہلال ان کے دادا اور عمر بن مخزوم پانچویں جد تھے۔ حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد ان کے چچا تھے۔ جنگ خندق میں حضرت علی کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے قریش کے سورما عمرو بن عبد ود کی بہن ریطہ بنت عبد ان کی والدہ تھیں۔ حضرت عبد اللہ بن سفیان ان کے سگے بھائی تھے۔

قبول اسلام

اسلام کے ابتدائی زمانے میں ایمان لائے۔

ہجرت حبشہ

اپنے بھائی حضرت عبد اللہ بن سفیان کے ساتھ حبشہ ہجرت کی۔ بنو مخزوم کے حضرت عیاش بن ربیعہ اور حضرت سلمہ بن ہشام بھی ان کے ہم راہ تھے۔ ابن جوزی نے مہاجرین حبشہ کی فہرست میں حضرت ہبار بن سفیان کا نام شامل نہیں کیا۔

ہجرت مدینہ

حضرت ہبار بن سفیان جنگ بدر کے بعد کسی وقت مدینہ پہنچے۔ وہ حبشہ سے لوٹنے والے اس قافلے میں

شامل نہ تھے جو ۷ھ میں شاہ نجاشی کی دی ہوئی دو کشتیوں میں سوار ہو کر مدینہ پہنچا۔

وقت شہادت

ایک شاذ روایت ہے کہ حضرت ہبار بن سفیان نے عہد رسالت میں ہونے والی جنگ موتہ میں شہادت پائی۔ جنگ موتہ میں گنتی کے آٹھ یا بارہ اہل ایمان شہید ہوئے۔ موسیٰ بن عقبہ واحد مؤرخ ہیں جنھوں نے غزوۂ موتہ میں ایک مخزومی صحابی کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے شہدا کا شمار کرتے ہوئے ہبار کے بجاے نام ہناد بن سفیان بن عبد الاسد لکھا، جب کہ اس نام کے کوئی صحابی نہ تھے۔ ابن حجر کہتے ہیں: ہناد ہبار کی تصحیف ہے۔ طبری کا کہنا ہے کہ حضرت ہبار نے جنگ یرموک میں شہادت پائی۔ اکبر شاہ نجیب آبادی نے اسی راے کو اختیار کیا ہے۔ واقدی، ابن اسحٰق، ابن سعد، ابن ہشام اور ابن کثیر کہتے ہیں: حضرت ہبار نے ۱۳ھ میں دور صدیقی میں برپا ہونے والی جنگ اجنادین میں جام شہادت نوش کیا۔ ابن کثیر کہتے ہیں: یہی بات درست ہے۔ بلاذری کا رجحان بھی یہی ہے۔

جنگ اجنادین

جنگ اجنادین یا فتح قیساریہ ۱۳ھ (۶ جولائی ۶۳۴ء) یا ۱۵ھ (۶۳۶ء) میں موجودہ اسرائیل کے بیت غوفرین یا بیت جبرین (Beit Guvrin) اور رملہ کے درمیان واقع مقام اجنادین پر رومی بازنطینی اور اسلامی فوج کے درمیان لڑی گئی۔ نوے ہزار پر مشتمل رومی فوج کی کمان تھیوڈرس یا ارطبون کے ہاتھ میں تھی، جب کہ حضرت خالد بن ولید تینتیس ہزار کی اسلامی فوج کی قیادت کر رہے تھے۔ جنگ میں پانچ سو پچھتر مسلمانوں نے شہادت کا نذرانہ پیش کر کے فتح حاصل کی۔ شہدا میں حضرت ہبار بن سفیان، حضرت عکرمہ بن ابو جہل، حضرت ابان بن سعید اور حضرت حارث بن ہشام شامل تھے۔ پچاس ہزار رومی جہنم واصل ہوئے۔

صدر اسلام کے شاعر حضرت زیاد بن حنظلہ تمیمی جنگ اجنادین کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

و نحن ترکنا ارطبون مطردا

إلی المسجد الأقصی وفیه حسور

”ہم نے ارطبون، Tribune کو مسجد اقصیٰ کی جانب دھتکارا ہوا چھوڑا، وہ وہاں درماندہ تھا۔“

عشیة اجنادین لما تتابعوا

و قامت علیهم بالعراء نسور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

"معرکۂ اجنادین کی شام، جب رومی چٹیل میدان میں اس حال میں ایک دوسرے پر گرے کہ ان پر گدھ مسلط ہو چکے تھے۔"

حضرت زیاد کو صحابہ کے تمام سوانح نویسوں نے صحابی قرار دیا ہے، جب کہ 'ایک سو پچاس جعلی اصحاب' کے شیعہ مصنف مرتضیٰ عسکری نے ان پر جعلی صحابی ہونے کا الزام دھرا ہے۔

اولاد

حضرت ہبار کی کوئی اولاد نہ تھی۔

مطالعۂ مزید: المغازی (موسیٰ بن عقبہ)، السیرۃ النبویۃ (ابن اسحٰق)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عبد اللہ بن سفیان رضی اللہ عنہ

حضرت عبد اللہ بن سفیان مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا کا نام عبد الاسد بن ہلال تھا۔ عمر بن مخزوم ان کے پانچویں جد تھے۔ ریطہ بنت عبد ان کی والدہ تھیں۔ حضرت ہبار بن سفیان سگے بھائی اور حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد چچا تھے۔ بلاذری نے حضرت عبد اللہ بن سفیان کے بجاے ان کا نام عبید اللہ بن سفیان لکھا ہے۔ ابن عبد البر، ابن اثیر اور ابن حجر نے عبد اللہ اور عبید اللہ، دونوں نقل کیے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن سفیان اور حضرت عبید اللہ حضرت ہبار بن سفیان کے دو سگے بھائی تھے۔ دونوں کے ایک جیسے حالات زندگی دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ بات درست نہیں۔ ابن عبد البر اور ابن اثیر نے ایک نام عبید اللہ بن شقیر بن عبد الاسد مخزومی لکھا ہے، ابن اثیر کہتے ہیں: حضرت عبد اللہ کے والد کا نام سفیان بن عبد الاسد تو مشہور ہے، جب کہ شقیر بن عبد الاسد نام کو کوئی نہیں جانتا، یہ راوی ابو عمر کا وہم ہے۔

قبول اسلام

حضرت عبد اللہ بن سفیان نے بعثت نبوی کے فوراً بعد ایمان کی سعادت حاصل کی۔

ہجرت حبشہ

حضرت عبد اللہ بن سفیان نے اپنے بھائی حضرت ہبار کے ساتھ حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں حصہ لیا۔ بنو مخزوم کے حضرت عیاش بن ربیعہ، حضرت ہشام بن ابوحذیفہ اور حضرت سلمہ بن ہشام بھی ان کے ہم راہ تھے۔

مدینہ کی طرف ہجرت ثانیہ

حضرت عبد اللہ بن سفیان جنگ بدر کے بعد کسی وقت مدینہ پہنچے۔ وہ حبشہ سے لوٹنے والے اس قافلے میں شامل نہ تھے جو ۷ھ میں شاہ نجاشی کی دی ہوئی دو کشتیوں میں سوار ہو کر مدینہ پہنچا۔ عہد رسالت کی کسی مہم میں ان کی شرکت کی اطلاع نہیں ملتی۔

شہادت

حضرت عبد اللہ بن سفیان ۸ تا ۱۳ رجب ۱۵ھ (۱۵ تا ۲۰ اگست ۶۳۶ء) کو رومی اور اسلامی فوجوں کے درمیان لڑی جانے والی جنگ یرموک میں مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر کھدائی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح شام کی بشارت دی تھی جو جنگ یرموک میں پوری ہوئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

جنگ یرموک

پس منظر اور پیش منظر

۱۲ھ کا حج کرنے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر نے حضرت عمرو بن العاص، حضرت یزید بن ابوسفیان، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت شرحبیل بن حسنہ کی قیادت میں چار فوجیں شام کی طرف بھیجیں۔ وہاں حضرت عکرمہ بن ابوجہل اپنی چھ ہزار کی فوج کے ساتھ ان کی مدد کے لیے موجود تھے۔ اسلامی افواج کی آمد کی خبر سن کر شاہ روم ہرقل خود انطاکیہ آیا اور چاروں فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے الگ الگ کمان میں چار لشکر ترتیب دیے۔ رومیوں کی زبردست تیاریاں دیکھ کر حضرت ابوبکر نے حضرت عمرو بن العاص کے مشورے پر چاروں فوجوں کو یکجا ہونے کا حکم دیا۔ حضرت خالد بن ولید اس وقت عراق کی مہمات میں مصروف تھے، انھوں نے ان کو بھی سپاہ لے کر فوراً اسلامی افواج میں شامل ہونے کی تاکید کی۔ حضرت خالد جس وقت شام پہنچے، ان کا

سامنا رومی جرنیل باہان کی فوج سے ہو گیا، جسے انھوں نے سخت مقابلہ کر کے خندقوں میں گھسنے پر مجبور کر دیا۔

اب یرموک میں دو لاکھ ستر ہزار رومی بازنطینی فوجیوں کا سامنا کرنے کے لیے چالیس (چھیالیس: طبری) ہزار مسلمان موجود تھے جن میں ایک سو بدریوں کو ملا کر کل ایک ہزار صحابہ شامل تھے۔

یرموک (Hieromyax) شام کے دریاے یرموک کے کنارے، گولان کی پہاڑیوں سے چالیس میل دور ایک سطح مرتفع ہے جو موجودہ اسرائیل، اردن اور شام کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ اسلامی فوج طلال جموع (Hill of Samein) پر اکٹھی ہوئی اور رومی فوج نے دیر ایوب اور دریاے یرموک کے بیچ وادی واقوصہ میں پڑاؤ ڈالا۔ اسلامی فوج کے سارے دستے اکٹھے ہو گئے تو کمان حضرت خالد بن ولید کے حصے میں آئی۔ انھوں نے فوج کو بے ترتیب پایا تو ایک خطبہ دے کر فوج کی صف بندی اور تنظیم کی اہمیت واضح کی۔

یرموک کی چھ روزہ جنگ میں ایک کم تر فوج نے ایک برتر فوج کو برتر جنرل شپ کے ذریعے سے شکست دی۔ حضرت خالد بن ولید کو میدان جنگ کے اونچ نیچ کا خوب علم تھا، وہ خوب جانتے تھے کہ اس کارزار میں اپنی قلیل فوج سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی بہترین اسٹریٹیجی کے ذریعے سے اپنے دستوں کو اپنی مرضی کے مطابق آگے پیچھے کیا، کم زور مقامات پر اپنی قوت مرکوز کر کے کئی گنا زیادہ فوج رکھنے والے دشمن کو حرکت (movement) سے بے بس کر دیا اور اس کی فرار کی راہیں مسدود کر کے برے انجام سے دوچار کیا۔ رومی جرنیل اس صلاحیت سے عاری تھے۔ ان کی گھڑ سوار فوج (cavalry) نے کوئی کارکردگی دکھائی نہ چوتھے دن حاصل ہونے والی برتری سے ان کے کمانڈروں نے کوئی فائدہ اٹھایا۔ میدان جنگ ایک لاکھ بیس ہزار رومیوں کے خون سے لت پت ہو گیا۔ بلاذری نے رومی مقتولین کی تعداد ستر ہزار بتائی ہے۔ تین ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ شہدا میں حضرت عکرمہ بن ابوجہل، حضرت عبداللہ بن سفیان، حضرت عمرو بن سعید، حضرت ابان بن سعید، حضرت سہیل بن عمرو، حضرت ہشام بن العاص اور حضرت سعید بن حارث شامل تھے۔ کچھ مؤرخین کو شبہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سفیان کی شہادت جنگ یرموک میں ہوئی۔ ابن خلدون نے شہداے یرموک میں نام سیار بن سفیان لکھا ہے جو کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے، کیونکہ اس نام کے کسی صحابی رسول کا ذکر نہیں ملتا۔

شکست کے بعد شاہ روم ہرقل انطاکیہ سے نکلتے ہوئے بولا: اے ارض شام، تجھے الوداعی سلام، اب کوئی رومی کبھی بھی تیری طرف لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اے شام، تو کتنی اچھی سرزمین ہے جو دشمن کے ہاتھ لگی ہے۔ تجھے

الوداعی سلام۔

اولاد

حضرت عبد اللہ بن سفیان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

روایت حدیث

علی بن ابو بکر الہیثمی نے طبرانی کی ''المعجم الکبیر'' کے حوالے سے حضرت عبد اللہ بن سفیان کی دو روایتیں نقل کی ہیں: 'ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احتجم و ھو صائم' ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں پچھنا لگوایا'' (مجمع الزوائد، رقم ۵۰۰۱)۔ 'لا صام من صام الأبد' ''جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اس کا کوئی روزہ شمار نہ ہو گا'' (مجمع الزوائد، رقم ۵۱۶۷)۔

افسوس ہے کہ یہ روایات علی الترتیب حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور کچھ دوسرے راویوں سے تو منقول ہیں، لیکن حضرت عبد اللہ بن سفیان کے طریق سے حدیث کی کسی کتاب، حتیٰ کہ المعجم الکبیر، طبرانی میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، انساب الاشراف (بلاذری)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

محمد ذکوان ندوی

داعی اور رہنما یا خدا کا انتخاب

قربِ قیامت سے متعلق ایک طویل روایت میں ایک قولِ رسول اِن الفاظ میں آیا ہے: 'لا تقوم الساعةُ حتى يُبعثَ دجّالون كذّابون، قريبٌ من ثلاثين. كُلُّهم يزعُمُ أنّه رسولُ الله' (مسلم، رقم ۱۵۷۔ بخاری، رقم ۳۶۰۹)۔ اِس کے علاوہ، اِس سے متعلق سنن ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں: '... وإنّه سيكون في أمتي ثلاثون كذّابون، كُلُّهم يزعُمُ أنّه نبيٌّ، وأنا خاتَم النبيين، لا نبيَّ بَعدي' (رقم ۴۲۵۲)۔ اِن دونوں اقوالِ رسول کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہو گی، جب تک تیس کے قریب دجال اور کذاب پیدا نہ ہو جائیں۔ اِن میں سے ہر اٹھنے والا شخص اِس زعم میں مبتلا ہو گا کہ وہ کوئی عام مصلح اور داعی نہیں، بلکہ وہ اللہ کے ایک منتخب پیغمبر کی حیثیت رکھتا ہے۔''

> ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہو گی، جب تک میری امت میں تیس کذاب پیدا نہ ہو جائیں۔ اِن میں سے ہر اٹھنے والا شخص اِس زعم میں مبتلا ہو گا کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میں تمام پیغمبروں کے آخر میں ظاہر ہونے والا پیغمبر ہوں، اب میرے بعد اور کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔''

یہ ایک بے حد اہم روایت ہے۔ تاہم اِس تحریر میں روایت کا صرف درج ذیل حصہ ہمارے پیش نظر ہے: 'كُلُّهم يَزْعُمُ أنّه رَسُولُ الله'۔ روایت کے مذکورہ الفاظ دورِ آخر میں ظاہر ہونے والے فتنوں کی نسبت سے، بلاشبہ انتہائی بامعنی ہیں۔ اِس سے مراد دراصل پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے عرصۂ نبوت (بعثت تا قیامت) میں اٹھنے والے وہ 'مذہبی' اور سیکولر، دونوں قسم کے علما، فلاسفہ اور مفکرین ہیں جو مرشد،

www.javedahmadghamidi.com

داعی، معلم اور استاذ کے مطلوب مقام سے گزر کر عملاً لوگوں کے درمیان ''رسول اللہ'' کا درجہ حاصل کر لیں گے۔ کوئی مفکر، فلسفی اور سائنس دان کے سیکولر نام پر، اور کوئی امام، مرشد، رَبائی، عالم، پوپ اور گرو جیسے مقدس 'مذہبی' نام پر۔ یہی وہ ظاہرہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'الأئمة الْمُضِلُّون' (صحیح الجامع، رقم ۱۵۵۱) قرار دیا ہے، یعنی ''سلطانی وملائی وپیری'' کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو گم راہ کرنے والے 'مذہبی' اور سیاسی رہنما۔

دورِ جدید میں فکری اعتبار سے، عملاً یہی 'مذہبی' اور سیکولر مفکرین دنیا کے اعلیٰ ذہنوں کے لیے عملاً ایک بے خطا (infallable) قسم کا رول ماڈل (role model) بن گئے ہیں۔ وہ اکثر اپنے خود ساختہ نظریات کے مطابق، عملاً اُن کے پورے نظامِ فکر و عمل کی تشکیل کر رہے ہیں۔ دوسری طرف، اعلیٰ ذہن کے حامل اِن افراد کے علاوہ، بقیہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن کی اکثریت عملاً آزادی اور انٹرنیٹ کے مرشدِ مطلق سے فیض حاصل کرتی ہوئی حیا باختگی اور منشیات کے سرطان میں مبتلا ہو کر محض تفریحی کلچر اور فلم انڈسٹری کے مذکر اور مؤنث 'ہیروز' کو اپنے لیے رول ماڈل بنائے ہوئے ہے۔ اِسی طرح 'مذہبی' دنیا کے بیش تر افراد صرف مراسم اور 'عقائد' کو اپنا معبود بنا کر اُس خدا کو فراموش کر چکے ہیں جس کی عبادت اور جس کا خوف و محبت دین اللہ کا اصل جوہر تھا۔ اِس طرح پوری دنیا عملاً اللہ کے سچے پیغمبروں کے بجائے، اِن 'جھوٹے پیغمبروں' (false prophets) کو اپنا فکری اور عملی ماڈل بنا چکی ہے۔ گویا اب یہی 'مذہبی' اور سیکولر مفکرین عملاً اُن کے لیے 'اللہ اور رسول' کا قائم مقام بن چکے ہیں۔

مذکورہ ارشادِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ آخر میں ظاہر ہونے والے یہ 'دجاجلہ' محض عام قسم کے معلم، مرشد، داعی اور مفکر نہیں ہوں گے، بلکہ وہ اپنے تمام تر علم و تفلسف اور رشد و ارشاد کے ساتھ عملاً اِس زعم میں بھی مبتلا ہوں گے کہ اُن کا کیس کوئی سادہ کیس نہیں، بلکہ اُن کی حیثیت پیغمبر ہی کی طرح 'خدا کے ایک منتخب' (chosen) داعی اور مفکر کی ہے۔ اُن کا یہی اِدعا اور اِذعان اُن کے باطل افکار کا اسیر بنا کر لوگوں کو خدا کی کتاب اور اُس کے رسول کی اصل صراطِ مستقیم سے برگشتہ کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ 'مذہبی' اور سیکولر، دونوں میدانوں میں اِس طرح کے 'دجاجلہ' اسود بن کعب عنسی (وفات: ۱۱ھ) اور مسیلمہ بن حبیب حنفی الکذاب (وفات: ۱۲ھ) سے لے کر عہدِ حاضر کے اِس پورے عرصۂ نبوت میں ہمیشہ اٹھتے رہے ہیں۔ اِن سب میں جو چیز قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے، وہ اپنے متعلق اُن کا یہی

مذکورہ قسم کا جھوٹا اور بے اصل دعویٰ و اِذعان تھا۔

تاہم متعین طور پر کسی شخص یا افراد پر کوئی حکم لگانا ہمارا کام نہیں، یہ صرف اللہ کا کام ہے جسے وہ صرف آخرت میں انجام دے گا (البقرہ ۲: ۱۱۳)۔ اِسی طرح اللہ کے ہاں کسی آدمی کے فکر و عمل کا فیصلہ اُس کی نیت کے اعتبار سے ہو گا اور نیت، یعنی اصل جذبۂ محرکہ اور روح عمل کا حتمی علم صرف اللہ کو ہے، کسی اور شخص کو نہیں، اِلّا یہ کہ وہ خود اپنے قول و فعل سے واضح طور پر اِس کا اظہار کر دے۔ چنانچہ وہ اہل علم، خادمان دین، داعیان اسلام اور اساتذۂ کرام مذکورہ ارشاد رسول میں بیان کردہ اِس ظاہرے سے بالکل پاک قرار پائیں گے، جو صدق و امانت کے ساتھ ہمیشہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلاتے رہے؛ نیز بوقت یاددہانی وہ دل کی پوری گہرائی کے ساتھ اپنی اصلاح کے لیے ہر وقت ایک مرد مومن کی طرح تیار رہے اور نہ صرف اصولاً، بلکہ عملاً خود اپنے متعلق ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ:

میں تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ میرے ساتھ بھی نفس و شیطان کی آزمایش جاری ہے۔ اللہ اُس شخص پر رحم فرمائے جو میرے عیوب سے آشنا کرے اور مجھ پر میری غلطی واضح کرے۔ میری ذات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہرگز بالاتر نہیں۔ نہ مجھ پر وحی آتی ہے اور نہ میری بات حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ میں صرف کتاب و سنت کا ایک داعی اور معلم ہوں۔ غلطی سے پاک ہستی صرف اللہ کی ہے اور غلو و بے اعتدالی سے بلند صرف اُس کے رسول کی ثابت شدہ تعلیمات ہیں۔ کتاب و سنت کے سوا، کسی بھی چیز کو 'معصومیت' کا یہ درجہ حاصل نہیں۔ لہٰذا، میں یا میرے افکار ہرگز سچائی کا حتمی معیار نہیں بن سکتے۔ یہ صرف اللہ کی کتاب قرآن مجید اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ اور آپ کی ثابت شدہ سنت ہے جس کو حق و باطل کے درمیان معیار حق کا درجہ حاصل رہے گا۔

(لکھنؤ ۵/ جنوری ۲۰۲۲ء)

ڈاکٹر عرفان شہزاد

بچوں کی شخصیت سازی سے پرہیز اور ان کی ضروری فراغت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منفرد شکل و صورت کی طرح ہر بچہ منفرد شخصیت اور خاص صلاحیت یا ٹیلنٹ کا مالک بھی ہوتا ہے۔ بچوں کو دوسرے بچوں کی نقالی اور پیروی کی تلقین ان کی اپنی شخصیت کی نشو و نما اور ان کی خود اعتمادی کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ والدین کا کام اپنے بچے کو دوسرے بچوں جیسا بنانا نہیں، بلکہ اپنے بچے کی منفرد شخصیت اور مخصوص صلاحیت کو پروان چڑھنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔

بچہ اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری مواد اپنے ماحول سے خود لے لیتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کے ماحول میں منفی رجحانات اور رویے موجود نہ ہوں، اور اگر ہوں تو اسے متاثر نہ کر پائیں۔

شخصیت کی پرورش میں والدین کو صرف سہولت کار کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ انھیں بچوں کی شخصیت سازی نہیں کرنی چاہیے۔ شخصیت ان میں خدا نے پہلے سے ودیعت کر رکھی ہوتی ہے۔ انھیں بس اسی کو ابھارنا اور اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

سیکھنے کے عمل میں بچوں کو ان کی ابتدائی غلطیوں پر بھی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ انھوں نے کوشش تو کی۔ کرنے کا اصل کام کوشش ہی ہے۔ بڑے صبر اور سکون سے ان کی غلطیوں کو سیکھنے کے عمل کا حصہ بنا دینا چاہیے۔

بچے کی اپنی خاص صلاحیت کے علاوہ دوسرے مضامین اور شعبہ جات میں بچے کی کم کارکردگی ان کی قابلیت

ماپنے کا درست پیمانہ نہیں ہوتی۔

بچے کا فطری ہنر اگر بچے کی پیشہ ورانہ زندگی کا حصہ بھی بن جائے تو دنیا میں اس سے بڑھ کر لطف اور مسرت کوئی نہیں۔ اکثر و بیش تر یہ کیریئر میں کامیابی کی ضمانت بن جاتا ہے۔

بچے کی خاص صلاحیت یا ٹیلنٹ کی دریافت کے اس عمل میں دھیرج برتنا ضروری ہے۔ بچے پر دباؤ نہ ڈالا جائے، ورنہ اس کی صلاحیت کھلنے سے پہلے ہی دب سکتی ہے۔ علامہ اقبال کے بیٹے، ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: انھیں بچپن میں مصوری کا شوق تھا۔ علامہ اقبال کو توقع ہوئی کہ شاید یہ بہت اچھا مصور بن سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یورپ سے نام ور مصوروں کی کچھ پینٹنگز منگوا کر انھیں دیں۔ ان کو دیکھ کر جاوید اقبال کا حوصلہ جواب دے گیا کہ وہ ایسے مصور کبھی نہیں بن سکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے مصوری چھوڑ دی۔

توقعات کا بوجھ ذہنی دباؤ اور تناؤ پیدا کرتا ہے، جو بہت نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان توقعات کے ہاتھوں بعض ذہین طلبہ بھی ذہنی مریض بن جاتے ہیں، تعلیم ترک کر بیٹھتے ہیں، کم نمبر آنے پر طلبہ کی خود کشی کے سلسلہ وار واقعات اسی کا نتیجہ ہیں۔

والدین اور اساتذہ کو مشاہدہ کرتے رہنا چاہیے کہ ان کا بچہ کس قسم کے طبعی رجحانات رکھتا ہے۔ کس مضمون یا کام میں مہارت دکھاتا ہے، جسے کرتے ہوئے اسے زیادہ دقت نہیں ہوتی اور اس کی مشغولیت اسے لطف دیتی ہے، بس یہی اس کی فطری صلاحیت یا ٹیلنٹ ہے، یہی اس کا میدان عمل ہے۔

کسی گھرانے کے تمام بچے اگر تعلیم اور فکر کے لحاظ سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے نظر آئیں تو گمان کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی انفرادی شخصیت مسخ کر دی گئی ہو گی، انھیں ایک ہی سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کیا گیا ہو گا۔

بچے کا فکر و ہنر تعلیمی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر تعلیمی نوعیت کا بھی، جیسے کھیل، کاروبار، فنون لطیفہ وغیرہ کا۔ دونوں صورتوں میں بچے کا اصل میدان عمل وہی شعبہ ہو گا۔ اسی میں بچے کو آگے بڑھنے کا موقع دینا چاہیے۔ فکر اور عمل کی رنگا رنگی قدرت کی فیاضی کا اظہار اور زندگی کے حسن و ارتقا کا سبب ہے، اس سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اسے اپنی فطری جگہ حاصل کرنے اور نشو و نما دینے میں اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہی کرنے کا اصل کام ہے۔

ضروری فراغت

مقولہ مشہور ہے کہ فارغ ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ اس بنا پر کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں کو فارغ نہ رہنے

دیا جائے، لیکن ایک دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ تخلیقی ذہانت کی نمو اور نمود فراغت کے دوران میں ہی ہوتی ہے۔ بڑے تخلیق کار خود کو باقاعدہ فراغت میں مبتلا کرتے ہیں تو نئے خیالات جنم لیتے ہیں۔

یہ چلن ہو گیا ہے کہ بچہ اسکول میں چھ آٹھ گھنٹے گزار کر واپس آئے تو ٹیوشن پڑھنے بھیج دیا جائے، وہاں سے چھوٹے تو قاری صاحب اسے دھر لیں، اس کے بعد کچھ دیر ٹی وی، انٹرنیٹ وغیرہ پر وقت بِتایا جائے اور پھر سونے کا وقت ہو جاتا ہے، اس طرح بچوں کی تخلیقی ذہانت کو سانس لینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

ادھر والدین مطمئن رہتے ہیں کہ انھوں نے بچے کو مصروف کر رکھا ہے، کسی منفی سرگرمی میں ملوث ہونے کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں، لیکن اس طرح بچے کی شخصیت میں ایک سطحی ذہن کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا، جس کا کام دو اور دو چار کی طرح اپنی روٹین پوری کرنا ہوتا ہے۔

انھی وجوہات سے بچوں میں تفہیم و تخلیق کی صلاحیت میں شدید کمی نظر آتی ہے۔ بچپن کے زمانے میں نئی نئی باتیں اور سوال کرنے والے بچے، کسی نئی یا گہری بات کو سمجھنے، سوچنے، تجزیہ کرنے جیسی مشقت میں پڑنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں کرتے، کوئی نیا خیال ان کو نہیں سوجھتا۔ دنیا بھر کی تخلیقی کاوشوں میں، خاص طور پر پاکستانی تعلیمی نظام اور سماج میں پروان چڑھے افراد کا حصہ اسی وجہ سے بہت کم ہے۔ کچھ سخت جان، البتہ پھر بھی نکل آتے ہیں جو کچھ تخلیقات اور اکتشافات کر دکھاتے ہیں، لیکن وہ مستثنیات ہیں جو ہر سماج میں زبردستی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ کسی تعلیمی اور سماجی نظام کے پروردہ نہیں ہوتے۔ ان کے وجود پر شکر تو کیا جا سکتا ہے، مگر اپنے نظام پر فخر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ یہ افراد نظام کی وجہ سے نہیں، بلکہ نظام کے باوجود پیدا ہو جاتے ہیں۔

کچھ وقت فارغ رہنے سے بچوں کے ذہن میں زندگی اور مذہب وغیرہ سے متعلق سوال ابھرنے لگتے ہیں۔ ان سوالات کو ہمارے ہاں شیطانی وساوس قرار دے کر ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے، حالاں کہ وہ بالکل فطری سوال ہوتے ہیں جو ہر سوچنے والے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے اندر علم اور حق کی تلاش کے فطری داعیات کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ اور یہ فطرت خدا کی پیدا کردہ ہے۔ انھیں شیطان سے منسوب کرنا غلط فہمی اور بدذوقی ہے۔ ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات دینے کے لیے والدین اور اساتذہ کو خود بھی علمی اور فکری تیاری کرنی چاہیے اور بچوں کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے کہ وہ آزادی سے خود ان کے جوابات تلاش کریں۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ بچوں کو ان کے تمام سوالات کے تیار جوابات دے دیے جائیں۔ انھیں خود غور و فکر کی محنت سے جواب تلاش کرنے کا موقع اور ترغیب دینی چاہیے۔ فوری جوابات سے ان کی فکری نشو و نما پوری

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طرح پنپ نہیں پاتی اور سہل انگاری بھی پیدا ہوتی ہے۔

فراغت کا مطلب یہ نہیں کہ بچے ٹیب یا موبائل فون لے کر بیٹھ جائیں۔ کسی وقت ان سے پڑھائی، ٹی وی، فون وغیرہ سب چھڑوا کر مکمل طور پر فارغ کر دینا چاہیے۔ کچھ بڑے بچوں کو یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ پیدل یا سائیکل وغیرہ پر کبھی لمبی سیر کو نکل جایا کریں یا گھر ہی میں کچھ وقت صرف اپنی ذات کے ساتھ گزارا کریں۔ اس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں، یہ ان کی فطری تخلیقی صلاحیت، اگر ان میں ہے تو انھیں خود بتا دے گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

قافلۂ نوحہ گراں

نوحہ گری ہمارے اجتماعی لاشعور میں کچھ ایسی رچ بس گئی ہے کہ اب ہماری فطرت ثانیہ ہے۔

مجھ سمیت ہر کوئی اداروں کے زوال کا نوحہ لکھ رہا ہے۔ اپنے تئیں اخلاقی مدرس ہے۔ 'اگر' سے بات شروع ہوتی اور 'چاہیے' پر تمام ہو جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ 'اگر' ہی وہ بھاری پتھر ہے جو کسی سے اٹھایا نہیں جا رہا۔ یہ محض ایک لفظ نہیں، نو من تیل ہے۔ نہ ہو گا، نہ رادھا ناچے گی۔ یہاں عام آدمی کی نگاہ پردہ اٹھنے کی منتظر رہتی ہے اور یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ناچ کبھی شروع نہیں ہوتا۔

اہل اسلام کے دانش وروں نے جتنی کتابیں 'اسباب زوال امت' پر لکھیں، شاید ہی کسی موضوع پر لکھی ہوں۔ ڈور الجھتی اس وقت ہے جب اسباب کی دوری زیر بحث آتی ہے۔ ہم یہ تو جان لیتے ہیں کہ یہ اسباب ہیں کیا؟ یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ انھیں دور کر لیا جائے تو زوال کا دور ختم ہو جائے گا، مگر یہ اسباب دور کیسے ہوں؟ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے آگے راستہ ختم ہو جاتا ہے۔ 'اگر' کوئی راستہ نہیں، اس لیے ہمارا قافلہ اسی موڑ پر رکا ہوا ہے۔

اب ایسا بھی نہیں کہ کسی نے راہ دکھائی نہیں۔ کسی نے اگر سنجیدہ کوشش کی تو ہمیں پسند نہیں آئی کہ اجتماعی شعور اس کا متحمل نہیں ہو سکا۔ ہم نے یہ چاہا کہ مسائل کا کوئی سادہ اور زود اثر حل ہمیں مل جائے۔ ہماری صفوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے ہماری اس خواہش کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس طرح کے سادہ حل پیش کیے جو اکثریت کو بھا گئے۔ ان کا کام چل نکلا۔ یہ الگ بات کہ مسائل اپنی جگہ موجود رہے۔ نہ صرف موجود رہے، بلکہ ہر اتائی صاحب حل نے ان میں حسب توفیق اضافہ بھی کر دیا۔ چند ایسے ہی حل ملاحظہ کیجیے: ''اگر پانچ سو افراد کو لٹکا دیا جائے تو سب سیدھے ہو جائیں'' یا ''صرف بارہ افراد ٹھیک ہو جائیں تو ملک ٹھیک ہو جائے'' یا پھر ''اس ملک کو ایک خمینی چاہیے''۔ فرقہ داریت یا مذہبی انتشار کا حل دیا جاتا ہے: ''سب مولویوں کو ایک جہاز میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بٹھا کر اسے سمندر میں ڈبو دینا چاہیے۔‘‘

ہر معاشرے میں ایسے اخلاقی واعظین ہونے چاہییں جو ’اگر‘ اور ’چاہیے‘ کی بات کرتے رہیں۔ یہ اجتماعی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ تلقین اور نصیحت تو ہو سکتی ہے، مگر مسئلے کا بنیادی حل نہیں ہوتی۔ یہ ایک اضافی قوت فراہم کرتی ہے جو بہتری کے سفر کو مہمیز دے دیتی ہے۔ زندگی ان حقائق سے عبارت ہوتی ہے جو صفحۂ ہستی پر لکھ دیے گئے ہیں۔ سردی کا موسم جب اترتا ہے تو ہمارے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اس موقع پر گرم کپڑوں کی اہمیت پر واعظ کی خوش گفتاری اور وعظ، سردی دور نہیں کر سکتے۔ سردی سے بچاؤ کے لیے کوٹ چاہیے؛ کوٹ کہاں سے آئے گا؟ اس سوال کا جواب واعظ کی ذمہ داری نہیں، اہل دانش کا کام ہے۔

مسائل کا سادہ حل اگر ممکن ہوتا تو انسانی تاریخ کچھ اور طرح کی ہوتی۔ مشرقی پاکستان میں بھی ’فوجی آپریشن‘ کو ایک سادہ حل کے طور پر اختیار کیا گیا۔ یہ خیال کیا گیا کہ ریاست کی قوت فیصلہ کن ہوتی ہے، جب بروے کار آئے گی تو سب خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے۔ معاملہ، مگر اتنا سادہ نہیں تھا۔ خرم مراد مرحوم نے جنرل یحییٰ خان کو توجہ دلائی تھی کہ مسائل اگر طاقت سے حل ہو سکتے تو عالم کا پروردگار، انبیا کے بجائے فیلڈ مارشل اور جنرل مبعوث کرتا۔ اس بات کو سمجھنے کے بجائے، اس پر برا منایا گیا۔ نتیجہ ہم نے بہ چشم سر دیکھ لیا۔

ہم آج اس ہمہ گیر زوال سے کیسے نکلیں جس نے ہمارے قومی وجود کا حصار کر لیا ہے؟ میرا احساس یہ ہے کہ حل سے زیادہ اہم وہ طریقہ ہے جو اس حل کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ فطرت نے اس باب میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسانی جسم میں خرابی ہو تو طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ پانی کی موٹر خراب ہو جائے تو مکینک سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اسی کا اطلاق سماج اور ریاست کے مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے۔ سماج بھی ایک مشین کی طرح ہے۔ اس کے بھی ماہرین ہیں۔ سماجی مسائل کا حل وہی بتا سکتے ہیں۔ ریاست بھی ایک مشین ہے۔ دنیا میں اس کے ماہرین بھی پائے جاتے ہیں۔

کامیاب ملکوں نے اس بنیادی بات کو سمجھ لیا ہے۔ جمہوریت کا حسن یہ ہے کہ ماہرین کی رائے میں ترجیح کے لیے ایک طریقۂ کار طے کر دیا گیا ہے جس میں انتخاب کا حق عوام کے پاس ہے۔ ساتھ ہی عوام یہ اختیار بھی رکھتے ہیں کہ جب چاہیں، اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ اگر ایک رائے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تو ان کے پاس یہ راستہ موجود ہے کہ وہ کسی دوسری رائے کو اپنا لیں۔ اس سے قائم شدہ آرا کی صحت کا فیصلہ خود وقت کر دیتا ہے۔ یہ ایک فطری طریقہ ہے جو کامیابی سے جاری ہے۔

مثال کے طور پر ایک ملک کو ایک معاشی مسئلے کا سامنا ہے۔ کئی معاشی ماہرین، مختلف حل تجویز کر رہے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہیں۔ عوام کی منتخب پارلیمان ان میں سے کسی ایک حل کو اختیار کر لیتی ہے۔ دنیا میں اس مقصد کے لیے تھنک ٹینکس بنائے جاتے ہیں۔ یہ تھنک ٹینکس حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کی حکمت عملی کے لیے رہنما اصول دیتے ہیں۔ یہ اصول پھر پالیسیوں میں منعکس ہوتے ہیں۔ اسی سے سماج بہترین کی راہیں تلاش کرتا ہے اور مثبت ارتقا اس کا امتیاز بن جاتا ہے۔

مسلم معاشروں میں جو ذہنی ڈھانچا تشکیل پایا ہے، اس میں ایک فرد واحد کو مسیحا مانا جاتا ہے اور پھر اس کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اقبال جیسا نابغۂ روزگار بھی سوال اٹھاتا ہے: 'کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں'؟ گویا کوئی فرد واحد، کوئی مسیحا ہو گا جو سب بت توڑ کر قافلۂ حیات کو اسلام اور توحید کی شاہ راہ پر ڈال دے گا، جس طرح غزنوی نے سومنات کے بت توڑ کر اس خطے میں توحید کا علم لہرایا تھا۔ (اقبال اپنی نثر میں بالکل دوسری بات کہتے ہیں، مگر اس وقت یہ میرا موضوع نہیں۔)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہر مسئلے کا حل مذہب میں تلاش کرتے ہیں۔ 'اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے' کا مطلب ہم نے یہ سمجھا ہے کہ وہ ہمیں زندگی کی جزئیات تک طے کر کے دیتا ہے۔ جو فیصلے عقل نے کرنے ہیں، ہم ان کی ذمہ داری بھی مذہب کو سونپ دیتے ہیں۔ اسے سادہ اسلوب میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ 'ہمارے تمام مسائل کا حل اسلام کے نفاذ میں ہے۔' یہ مذہب اور سماج، دونوں کی ناقص تفہیم کا نتیجہ ہے۔ ہم مذہب سے ایک ایسی بات منسوب کرتے ہیں جس کا خود اس نے کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ وجہ وہی سادہ حل کی تلاش ہے۔

اسی انداز نظر کا ایک مظہر یہ ہے کہ آج ہم اپنے تمام سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل عدالت سے حل کرانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ عدالت ہر کام کے لیے نہیں بنی تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ڈیم بنانا چیف جسٹس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ صفائی، بلدیہ کا کام ہے، عدالت عظمیٰ کا نہیں۔ سپریم کورٹ کے دو معزز جج صاحبان نے ہمیں یہی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اگر ہم نے اس بنیادی بات کا ادراک نہ کیا تو ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے، مزید الجھتے چلے جائیں گے۔ پھر ہم اسباب زوال امت تلاش کریں گے یا پھر نوحہ گری کریں گے۔ انسانی جسم کو لاحق عوارض کے لیے مشین مکینک کی نہیں، ایک حاذق طبیب کی ضرورت ہوتی ہے:

سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

(بشکریہ: روزنامہ دنیا، لاہور، ۳۰/ مارچ ۲۰۲۳ء)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد حسن الیاس

والد محترم —— چند یادیں، چند باتیں

والد گرامی قدر محمد الیاس حیدری اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ إنا لله وإنا الیه راجعون۔

ماں باپ کارشتہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارا پالن ہار کائنات کی تدابیر سر انجام دیتا ہے، اسی طرح اس کی تفویض سے دنیا میں اولاد کے لیے یہ خدمت والدین ادا کرتے ہیں۔ اس بنا پر ہر اولاد کا سر اپنے والدین کی عظمت کے آگے جھکتا، محبت سے ان کی طرف لپکتا اور ان سے تعلق کے جذبے سے سرشار رہتا ہے۔ لیکن میرے دل میں اپنے والد کی عظمت اس سے بڑھ کر تھی، اس لیے کہ وہ صرف ایک باپ نہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔

والد محترم کی زندگی کے تین ایسے پہلو ہیں جنھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میری علمی اور عملی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ انھیں دیکھ کر یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ہم بھی انھیں اپنائیں اور اپنی نسلوں میں بھی انھیں پیدا کرنے کی سعی کریں۔ وہ پہلو یہ ہیں:

محنت اور خود اعتمادی

۶۰ء کی دہائی تھی، والد صاحب پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہزارہ کی پہاڑیوں سے اتر کر کراچی پہنچے تو ان کے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی؛ تہذیبی لحاظ سے بھی اور معاشی لحاظ سے بھی۔ خاندان کئی پشتوں سے مذہبی علم کی تحصیل میں سرگرم رہا۔ تاہم والد صاحب کو یہ احساس تھا کہ وہ اصلاً اس مقصد کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ بچپن میں درس نظامی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، لیکن پھر عصری تعلیم کو اپنا میدان بنایا۔ کبھی ان کے ساتھ گاؤں سے گزر ہوتا تو بتاتے تھے کہ کیسے ان پہاڑی پگڈنڈیوں پر روزانہ میلوں کا سفر کر کے اسکول پہنچتے تھے۔ یہی

خواہش انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی لے آئی۔ پس منظر میں صرف باپ دادا کی علمی خدمات اور معاشی کسمپرسی تھی۔ گاؤں کے کسی تعلق دار نے قدرت اللہ شہاب سے ملاقات کرائی۔ ایک نوجوان کی تعلیم سے محبت دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ اسکالر شپ کی ذمہ داری لے لی۔ والد صاحب بتاتے تھے کہ اس زمانے میں کراچی کے چند علاقوں میں ہی بجلی ہوتی تھی۔ بیش تر وقت بر لب سڑک برقی قمقموں کی روشنی میں ہی پڑھتے اور ساتھ ملازمت بھی کرتے تھے۔ پہلے کالج کی تعلیم مکمل کی، پھر ٹیکسٹائل میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں اعلیٰ درجے کی نوکری مل گئی۔ ہمارے پورے گاؤں اور مضافاتی علاقوں میں پہلے نوجوان تھے، جو اس درجے تک تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ ملازمت پر فائز ہوئے ہوں۔ عین عالم شباب میں دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ ۳۶ سال کی عمر میں ایک کٹھن بائی پاس ہوا۔ کچھ عرصے بعد اسے دہرانا پڑا۔ اس دور کے حوالے سے ہمیں نصیحت کرتے ہوئے اپنی ایک یادداشت میں انھوں نے لکھا ہے:

”میں ۳۶ سال کی عمر میں دل کی تکلیف میں مبتلا ہوا، اسی سال اپنے پہلے بائی پاس آپریشن میں سی سی یو میں جیسے ہی ہوش میں آرہا تھا۔ نیم غنودگی سی تھی کہ پیٹھ پر معمولی سی خارش محسوس ہوئی۔ خود کوشش کی، مگر ہل جل نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا خود اپنے جسم پر خارش کرنے پر قادر نہ تھا۔ اسٹاف کو درخواست کی، مگر میری آواز اتنی مدھم تھی کہ شاید اس نے بھی نہیں سنی۔ اب کے بار مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے جاہ و مقام، عہدے و حیثیت، طاقت کے گھمنڈ اور جوانی میں انسانی لاچارگی کی حقیقت کا احساس ہوا، اور اسی احساس میں ندامت کے چار آنسو بھی بہ نکلے۔

میرے بچو، اس طرح کے واقعات آپ کے ساتھ بھی پیش آئیں گے۔ یہ انسان کی سرشت ہے کہ ہم بھول جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، صحت اور عمر کے تغیر و تبدل اسی کی یاددہانی کراتے ہیں۔ یہ دنیا کمرۂ امتحان ہے۔ اس عارضی سرائے کو مستقل نہ بناؤ۔

یہی ہماری حقیقت ہے۔ ہم دنیا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، لیکن اپنے جسم پر بھی اپنا حکم نہیں چلتا۔

پھر بچو، یہ گھمنڈ کس بات کا؟ جو جتنا جلد اپنی حیثیت کا ادراک کر لے اتنی جلدی اصلاح کی کوشش شروع کر دے گا۔ اپنی زندگی متوازن اور آخرت کو کامیاب بنانے کے لیے کوششیں شروع کر دے گا:

نہ سکندر ہے نہ دارا ہے نہ قیصر ہے نہ جم
بے محل خاک میں ہیں قصر بنانے والے“

یہ ابتدا تھی، اس کے بعد پوری عمر اسی مرض کے مختلف مراحل پیش آئے، مزید بائی پاس ہوئے، متعدد

اسٹنٹ ڈالے گئے، لیکن والد صاحب نے اس آزمایش کا چار دہائی تک جس قدر ہمت اور حوصلے کے ساتھ مقابلہ کیا، واقعہ یہ ہے کہ دیکھنے والے کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کچھ گزر رہا ہے۔ ہر صبح ایک نئی امید کے ساتھ ہوتی، ہر نئے امکان کو اسی ہمت سے تلاش کرتے، ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتے، زندگی اور اس کی رونقوں کو بھرپور طریقے سے جیتے اور سماجی رابطوں کو ہر وقت بحال رکھتے تھے۔

مختلف مذہبی تحریکوں سے بھی وابستہ رہے۔ تحریک ختم نبوت سندھ کے جنرل سیکٹری کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں، کم و بیش پچاس سال کا کارپوریٹ کیریئر رہا، ملنے والے ان کی ہمت اور حوصلے پر حیران ہو جاتے تھے۔ اطبا بھی یہی کہتے تھے کہ یہ آپ کی قوت ارادی اور اعتماد ہے، جو آپ کے اعضا کو جینے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔

والد صاحب نے یہی عادت ہم بچوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی، زندگی میں ہار مانے بغیر آگے بڑھنے کا جذبہ، ناممکنات میں سے حل نکالنا اور ایک دفعہ جو کرنے کی ٹھان لی، اسے کر گزرنا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ اعتماد وہ زندگی کے ہر ہر مرحلے پر ہمیں دیتے تھے۔ بچپن کی بات ہے، رمضان کا مہینا تھا، مجھے افطار کا کھانا دے کر پڑوس میں بھیجا کہ فلاں صاحب کو دے آؤ۔ میں نکلا تو مجھے ایک دوسرے پڑوسی نظر آئے، جن کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ ان کے اہل خانہ گھر پر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی رائے سے انھیں وہ کھانا یہ کہہ کر دے دیا کہ والد صاحب نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہ تو گڑبڑ کر بیٹھا ہوں، واپس لوٹا اور ان سے عرض کیا تو انھوں نے گلے لگایا اور فرمایا: تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ زندگی میں آگے بھی عقل کی روشنی میں جو کچھ ٹھیک لگے، بس وہی کرنا۔ مجھے کبھی اعتراض نہ ہو گا، چاہے میری مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ ان کے اس رویے ہی سے مجھ میں خود اعتمادی اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ پھر چاہے تعلیمی میدان کا انتخاب ہو، ہجرت کے فیصلے یا پھر عائلی زندگی کے معاملات۔ یہی مہمیز تھی جس نے بڑے بڑے فیصلے کرائے۔

ہمیشہ فرماتے تھے: بچو، منصب ذمہ داری سے ملتا ہے، اور ذمہ دار شخص کا رویہ ہمیشہ متنبہ رہنے والا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ آدھی رات کو مجھے جگا کر کہنے لگے کہ اٹھو، مجھے فیکٹری لے چلو، میں نے عرض کیا: آپ اتنے بڑے افسر ہیں، کسی دوسرے کی ملازمت میں اتنی جان گھلانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو فرمایا کہ بیٹا، جس نے میرے بچوں کی معاش کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے، مجھے بھی اس کے املاک کی حفاظت ایسے ہی کرنی ہے، جیسے

اس نے میری اولاد کی کی ہے۔اس نے میری ضروریات کی ذمہ داری لی،اس کی نگرانی میرا فرض ہے۔ والد صاحب یہ فرض عمر کے آخری سالوں تک بہت ایمان داری اور لگن سے نبھاتے رہے۔

وسعت نظر اور برداشت

والد محترم نے ایک خاص مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ بچپن تا بڑھاپا ایک گہری مذہبی روایت میں گزرا۔ بڑے بڑے علما اور بزرگوں کا نام بھی جڑا تھا۔ پھر جہاں جہاں آکر آباد ہوئے، سماجی اور معاشی وابستگیاں بھی اسی حلقۂ فکر سے وابستہ تھیں۔اس سب کے باوجود ایک عام آدمی کی حیثیت سے انھوں نے اپنے ذہن کو کبھی جمود کا شکار نہیں ہونے دیا۔ فکری سطح پر نئے افکار کی قبولیت کے لیے اپنے دماغ کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے۔ میرے دینی سفر کی ابتدا تبلیغی جماعت سے ہوئی اور میں کچھ عرصے بعد انھیں قائل کرنے لگا تو ایک دن مجھے لیا اور ہر مسلک کے بڑے علما کے پاس لے گئے۔ کہا: ان سے گفتگو کرو، ان کے زاویے کو بھی سمجھو، تم دیکھوگے کہ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ خیر ہے۔

میں نے جب دین کا عالم بننے کا فیصلہ کیا تو ارد گرد کا ماحول اس کے لیے سازگار نہیں تھا۔ والد صاحب نے اس موقع پر اسٹینڈ لیا اور مجھ سے کہا کہ میرے دیگر بچوں کے لیے جو وسائل ہیں، اس سے دگنے تمھارے اس کام کے لیے وقف کرتا ہوں، لیکن بس ایک نصیحت ہے کہ دین کا عالم بننا کسی مسلک اور فرقے کا نہیں، مگر انسان کہاں رکتا ہے۔ اس کے بعد میرے فکری سفر میں انتہائی سخت گیر مذہبیت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ مجھے والد محترم بھی گم راہ لگنے لگے۔ بڑی زور دار بحثیں ہوتیں۔ بسا اوقات رات رات بھر چلتیں، میں ان کی اس وسعت ذہنی کو آڑے ہاتھوں لیتا، ان کی بعض مذہبی سیاسی آرا پر بھی سخت ترین تنقید کرتا، لیکن جس کمال نے میرے سر کو چند ہی سالوں میں جھکا دیا، وہ ان کی قوت برداشت تھی۔

انھوں نے کبھی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ انھیں اندازہ تھا کہ اس کی عمر کا یہ وہ دور ہے جس میں جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، لہٰذا ان کو بھی باہر نکلنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس کے بعد خدا کا کرنا کہ میں غامدی صاحب کی فکر سے متاثر ہو گیا؛ بالکل ہی نیا مرحلہ۔ اس وقت ارد گرد کا ماحول گویا کہ مجھ پر پل پڑا ہو۔ خدا شاہد ہے کہ اس موقع پر ایک ہی شخص میرے سر پر سائبان بن کر کھڑا ہو گیا اور ہر ہر سطح پر تحفظ اور آزادی فراہم کرتا رہا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس فکری تبدیلی میں اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو جیسے بے آسرا محروم میمنے کو بدمست بھیڑیے نوچ نوچ کر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کھا جاتے ہیں، ہمارا بھی یہی انجام ہوتا، لیکن انھوں نے سب کو پیغام دیا کہ یہ اکیلا نہیں ہے، ہم اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔

والد صاحب مجھ سے اکثر پوچھتے کہ اس مسئلے میں اب تمھاری فکر کیا کہتی ہے؟ ان کا آخری دم تک ایک ہی اصرار تھا کہ دل اور دماغ کو کبھی بند مت کرنا۔ تم اگر آج صدق دل سے اپنا ذہن تبدیل کر کے کسی اور رجحان کے قائل ہو گئے تو میں تب بھی تمھارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔

اس ضمن میں ایک نصیحت ہمیشہ کرتے تھے کہ علمی اختلاف کے باعث کسی بھی مسلک کے بڑوں کی عزت میں کبھی کمی نہ کرنا۔ تمھارے دادا اور نانا بھی مخلص لوگ تھے۔ لہٰذا ان سے اختلاف ضرور کرو، لیکن ہمیشہ ان سے تعلق کو اپنے لیے باعث فخر سمجھو۔ انھی بنیادوں سے آدمی پہچانا جاتا ہے۔

صلح جوئی اور خیرات

ہر خاندان میں بعض ایسے افراد ہوتے ہیں جن کو ہر ایک اپنا بڑا سمجھتا ہے۔ اپنے دکھ درد ان کے سامنے لاتا، معاشی ناہمواریوں کا نالہ سناتا اور اپنی پریشانی میں اسی کے کاندھے پر سر رکھتا ہے۔

والد محترم کا ہمارے خاندان اور معاشرے میں یہی مقام تھا۔ اپنے پرائے، سب ان کی مجلس میں شریک ہوتے، ان سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے اور ذاتی یا کاروباری، ہر نزاع کے حل کے لیے انھی کی طرف دیکھتے تھے۔ انھوں نے پورے خاندان کو ایک وحدت میں پرو دیا ہوا تھا۔ اس ضمن میں جو سب سے اچھی عادت میں نے نوٹس کی، وہ یہ تھی کہ جب ایک فریق دوسرے کی کوئی شکایت کرتا تو اسے کبھی کہیں بیان نہ کرتے۔ مجھ سے ایک دن فرمانے لگے کہ ہر زخم بھر جاتا ہے، لیکن یہ ترش جملوں کے زخم نہیں بھرتے۔ لہٰذا صلح جوئی کا تقاضا ہے کہ انھیں کبھی بیان نہ کرو۔ اسی طرح آسودہ حال ہونے کے باعث ضرورت کے وقت ہر فرد کی نظر ان کی طرف اٹھتی تھی۔ اس معاملے میں ان کا دل گویا کہ موم تھا۔ جو کچھ کمایا اور اپنی ضرورت سے زائد سمجھا، اپنے مستحق رشتہ داروں پر خرچ کر دیا۔ ایک دن، مجھے یاد ہے کہ گاؤں سے کوئی شخص آیا، میں دفتر میں موجود تھا، جو کچھ جیب میں تھا، نکال کر دے دیا، میں بڑا ناراض ہوا۔ اتنے میں فیکس مشین کی آواز بلند ہوئی اور میمو نکلا، اتنی ہی رقم مستقل تنخواہ میں بڑھا دی گئی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ بیٹا، دل کبھی چھوٹا نہ کرنا، یہ اللہ سے تجارت ہے، جس میں کبھی خسارہ نہیں ہوتا۔ جو خرچ کرو گے، اللہ نسلوں کو لوٹائے گا۔ ان کے انتقال پر ایک

بڑے کاروباری صاحب ملنے آئے، کہنے لگے کہ میں مزدور تھا۔ پریشان حالی میں ایک دن ان کے دفتر میں آیا تو انھوں نے مجھے پاس بٹھایا، ٹھنڈا پانی پلایا اور کہا کہ میرے پاس آج کچھ نہیں، لیکن میں آپ کی ہمت بڑھانے میں مدد کر سکتا ہوں، پھر کافی دیر زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں سمجھایا، وہ صاحب کہنے لگے کہ میری ایسی مدد آج تک کسی نے نہ کی تھی، میں آج یہاں اسی باعث پہنچا ہوں۔

ان کا ہمیشہ ایک اصرار ہوتا تھا کہ زندگی تعلیم ہے اور تعلیم زندگی۔ بڑھاپے کے آخری مراحل میں بھی ہمیں ایک ہی چیز پر آمادہ کرتے رہتے کہ مزید تعلیم حاصل کرو، اور اس مقصد سے اپنے وسائل خرچ کرتے رہتے تھے۔

ہمارے والد محترم کی یہ چند خوبیاں اور یادیں آپ کے سامنے رکھیں۔ وہ اصلاً ایک عام آدمی تھے، لیکن عام آدمی کو کیسا ہونا چاہیے، اس میں وہ ایک مثال تھے۔ محنت، لگن، ہمت اور برداشت کا ایک نمونہ، علم و فکر میں وسعت اور بلندی کردار کی ایک داستان اور صلۂ رحمی، انفاق اور محبت کا ایک پیکر تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

والد گرامی قدر اپنا امتحان مکمل کر کے رخصت ہوئے۔ یہ دکھ تو یقیناً رہے گا کہ بقیہ زندگی ان کے فراق میں گزرے گی، لیکن اطمینان بھی ہے کہ اس عارضی زندگی سے حقیقی زندگی کے سفر میں وہ بڑی جاں فشانی سے خالق اور مخلوق، دونوں کے حقوق ادا کرتے رہے۔ امید ہے کہ اللہ کے فضل سے آخرت میں بھی سرخ رو ہوں گے۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى۔

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

پروفیسر نجات اللہ صدیقی: ایک فکری مسافر

(۲)

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی جماعت اسلامی کی product تھے۔ وہ اسی جماعت سے تادم اخیر وابستہ رہے، اگرچہ امریکی شہریت کے حوالے سے جماعت نے ان کی رکنیت شاید ختم کر دی تھی، جس کا ان کو ملال تھا، جیسا کہ ان کے بھتیجے جناب صدیق صاحب نے بتایا تھا۔ انھوں نے مولانا مودودی اور سید قطب کو بہت تفصیل سے پڑھا تھا، بلکہ مولانا مودودی سے مراسلت بھی کی اور بالمشافہ گفتگوئیں بھی کیں۔ عصر حاضر میں اسلام کی ضرورتوں کا جیسا کچھ ادراک ان کو تھا، تحریک میں شاید ہی کسی کو ہو۔ راقم کے خیال میں ان کے بہت سے خیالات و افکار مولانا مودودی کی بنیادی فکر غلبۂ اسلام سے صاف اختلاف پر مبنی ہے۔ اور بعض افکار میں انھوں نے فکر مودودی پر اضافے کیے ہیں، جیسا کہ اوپر گزرا، جن کا اعتراف جماعت میں مولانا مودودی کے غالی مقلدین کبھی نہ کر سکیں گے۔[۱۲] خواتین کے پردہ اور کارگاہ حیات میں ان کی فعال شرکت سے متعلق صدیقی مرحوم اور مولانا مودودی کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس سلسلہ میں صدیقی اخوانی علما کی راے اور اجتہاد کو قبول کرتے ہیں، مثلاً شیخ عبد الحلیم ابو شقہ، محمد الغزالی، وصفی عاشور ابوزید، لوئی صافی وغیرہم۔ اسی طرح مذہبی آزادی،

۱۲۔ اس سلسلہ میں راقم نے ۲۰۱۴ء میں شائع شدہ اپنی کتاب ”عالم اسلام کے مشاہیر“ (ص ۲۴۷) میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل مناسب حال ہے:

”جماعت اسلامی میں مسلسل یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ دین کو مولانا مودودی کے علاوہ کسی اور نے نہیں سمجھا اور دین کا جامع اور صحیح تصور تاریخ میں پہلی بار انھوں نے ہی پیش کیا ہے۔“

یہ کتاب ffosi.org پر بھی دست یاب ہے۔

آزادی اظہار راے اور غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں وہ تمام حقوق دینے کا مسئلہ ہے جو موجوزہ زمانہ کا norm ہے، یعنی شہریت اور حقوق مدنیت میں مساوات۔ نجات صاحب اس کے قائل ہیں کہ جس طرح مسلمان غیر مسلم ریاستوں میں اپنے لیے مساوی حقوق شہریت کا مطالبہ کرتے ہیں، اسی طرح اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو وہ سارے حقوق دینے چاہییں، جو آج تمام شہریوں کے حقوق سمجھے جاتے ہیں، جب کہ مولانا مودودی اسلامی ریاست کو ایک نظریاتی ریاست قرار دیتے ہوئے غیر مسلموں کو ریاست میں کلیدی عہدے دینے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح نجات صاحب کی راے میں ارتقا (evolution) کی تھیوری کو علمی بنیادوں پر سمجھنا چاہیے، اور اس کے لیے وہ ماضی کے علمی ورثہ میں ابن مسکویہ اور رومی وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں، ڈارون کا نہیں۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں مولانا مودودی نے جس تشدد کا اظہار کیا ہے اور خواہ مخواہ جمہوریت کو حاکمیت الٰہ سے متصادم کرادیا ہے اور جماعت کے سارے اصاغر واکابر ابھی تک اسی راگ کو الاپ رہے ہیں۔ ’’زندگی نو‘‘ میں چھپے ایک مضمون میں نجات صاحب نے اس بارے میں لکھا ہے کہ :

> ’’جمہوریت کے بارے میں ہمارے لوگ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، مگر جمہوریت سے دنیا میں کیا سمجھا جاتا ہے، اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ جمہوریت سے عام طور پر دنیا میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب صرف حکمراں ہی قانون کا مطلق سورس نہیں ہے، بلکہ عام لوگوں کو بھی ریاست کے معاملات چلانے میں کچھ عمل دخل ہے۔‘‘ (جون ۲۰۰۴ء)

مولانا مودودی کی ٹھیٹ اور اندھی تقلید کی وجہ سے جماعت اسلامی ہند ملکی سیاست میں شرکت کے حوالے سے اپنے آپ کو ایک بند گلی میں پاتی رہی اور اس مخمصہ سے نکلنے میں اسے دہائیاں لگ گئیں۔[۱۳]

ڈاکٹر نجات صاحب کوئی چیز یونہی رواروی میں نہیں لکھتے تھے، نہ لفاظی کرتے، ان کے ہاں اصل مصادر اور ریسورسز سے بھرپور استفادہ کے ساتھ ہی عصری ضرورتوں اور مسائل کا ادراک، زمانہ سے بھرپور آگہی اور ایسی بصیرت ملتی تھی جو صرف کسی فن کے ائمہ کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ سامنے کی مثالوں سے اپنی بات ثابت کرتے اور دل نشیں اور عقلی انداز استعمال کرتے۔ انھوں نے انگریزی میں ’’Islamic Thought‘‘ کے نام سے ایک

۱۳۔ اس سلسلے میں مزید گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا سلطان احمد اصلاحی، حاکمیت الٰہ پر تنقیدی سلسلہ، جوان کے رسالہ علم وادب میں ۱۲ اقساط میں شائع ہوا۔ نیز ’’غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں مسلم اقلیت کا مطلوبہ کردار‘‘ اور ’’آزاد ہند میں مسلم سیاست‘‘، شائع کردہ ادارہ علم وادب، دارالانس ۴/۲۱ بی، نزد پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔

مجلہ بھی کئی برسوں تک نکالا، جو علمی و فکری حلقوں میں دل چسپی سے پڑھا جاتا تھا، خاص طور پر intellectual کلاس کے درمیان۔

راقم نے ان کو پڑھا تو بچپن سے ہی تھا، مگر کبھی ملاقات کا یا مراسلت کا خیال نہیں آیا۔ یہ غالباً بیسویں صدی کی آخری دہائی کی بات تھی، راقم نے لکھنؤ کے ایک مجوزہ اخوانی الفکر ادارہ معہد الفکر الاسلامی (مجوز مولانا ظہیر احمد صدیقی ندوی) کے ساتھ مل کر مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے لیے ایک خصوصی تربیتی نصاب ترتیب دیا۔ اور اس کو لے کر علی گڑھ کا سفر کیا، جہاں کے علما و دانش وروں سے ایک ہفتہ تک استفادہ، مشاورت اور ملاقاتیں کیں، مگر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ البتہ مولانا ظہیر صاحب نے یہ تربیتی کورس ڈاکٹر نجات صاحب کی خدمت میں بھی بھیج دیا تھا، جس پر ایک نپا تلا تجزیاتی اور تنقیدی جامع تبصرہ انھوں نے ایک صفحہ میں لکھ کر ارسال فرمایا۔ ان کے تبصرے نے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ بس اس کے بعد دل نے شدت سے چاہا کہ ان کی خدمت میں حاضری دی جائے اور ان سے کسب فیض کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد اسلامی تحریکات کی موجودہ فکر اور ان کی ناکامیوں سے متعلق ایک مراسلہ علی گڑھ کے پتا پر لکھا، جس میں مولانا مودودی کی فکر پر مولانا وحید الدین خاں وغیرہ کی تنقید کا ذکر بھی تھا۔ امید تھی کہ جواب تو شاید ہی ملے (جیسا کہ عام طور پر قائدین، علما اور دانش وروں کا اب تک کا تجربہ رہا تھا)۔ ایک ہفتہ بعد حیرت ہوئی جب علی گڑھ سے ایک فون آیا اور ادھر سے آواز آئی: ''میں نجات اللہ صدیقی بول رہا ہوں''۔ اس کے بعد انھوں نے میرے مراسلہ پر اظہار خیال کیا، ملاقات کی خواہش بھی ظاہر کی۔ قریبی زمانہ میں کسی سیمینار میں علی گڑھ جانا ہوا۔ اُس وقت علی گڑھ سے واقفیت سرسری سی تھی۔ رفیق سفر تصوف کے معروف اسکالر مفتی مشتاق تجاروی تھے، جو رابطہ عامہ کے بڑے ماہر ہیں۔ میں نے نجات صاحب کی علی گڑھ میں موجودگی کا تیقن کر لیا تھا، اُن کو فون کیا، وقت لیا اور شام کے خالی وقت میں ہم دونوں مستقر سے باہر جانے کے لیے نکلے تو مزمل منزل کی طرف جا نکلے، جس کے قریب ہی نجات صاحب کا مکان تھا۔ تجاروی صاحب کو کسی پروفیسر صاحبہ کے آستانہ پر حاضری دینی تھی، وہ مجھے نجات صاحب کے دروازے پر چھوڑ کر رفوچکر ہوئے اور میں ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ یہ ان سے بالمشافہ پہلی دید و شنید تھی۔ تفصیل سے بات چیت ہوئی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو کے تعاون سے جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے مختلف جامعات کے اسلامک اسٹڈیز کے نصاب سے متعلق ایک ورکشاپ منعقد کیا تھا۔ راقم گو اس میں شریک نہ تھا، مگر صدر شعبہ

پروفیسر اختر الواسع صاحب نے افتتاحی اجلاس میں اسے بلالیا، جس میں کلیدی نوٹ پر وفیسر نجات اللہ نے پڑھا تھا، جس کو راقم نے ماہنامہ ''افکار ملی'' میں شائع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد راقم نے ایک مقالہ ''ہندوستان میں اسلام، مسلمان اور سیکولرزم'' کے عنوان پر لکھا اور ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ راقم نے اس میں لکھا تھا کہ ''قرآن میں خدا کی حاکمیت تکوینی معنی میں استعمال کی گئی ہے۔ اُسے زمین پر اتار کر جمہوریت اور سیکولرزم کو اُس سے ٹکرانا مناسب رویہ نہیں۔'' نجات صاحب نے اس میں ترمیم کی اور کہا کہ ''حاکمیت الہٰ تکوینی و تشریعی، دونوں معنوں میں ہے۔'' انھی دنوں اسلام میں آزادی فکر کے موضوع پر میرا ایک مضمون ''افکار ملی'' میں شائع ہوا، جس کو انھوں نے بہت پسند کیا اور فون کر کے اس پر مبارک باد دی۔ تقریباً ایک سال بعد شاہین باغ نئی دہلی میں ان کے فلیٹ پر ملاقات ہوئی اور راقم نے ان کا ایک تفصیلی انٹرویو کیا، جس میں انھوں نے یہ اظہار خیال کیا کہ ''ایسی دینی فکر کی ضرورت ہے جو بدلتے وقت میں زمانہ کی ضرورتوں کا ساتھ دے سکے، اس کے لیے آزادی اظہار رائے کی ضرورت ہے اور جو لوگ آزادی اظہار رائے پر چیں بہ جبیں ہوں، ان کو قرون اولیٰ کے اسلامی معاشرہ کی صحت مندانہ اور صالح اقدار دوبارہ یاد دلانے کی ضرورت ہے۔''

ایک سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

''جو نصوص ہیں، ان کے جو معانی و مطالب ساتویں صدی میں لیے گئے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ آج ڈیڑھ ہزار سال بعد بھی متعلق اور relevant ہوں۔ مثال کے طور معاشرت میں یہ تصور عام ہے کہ مرد حکمراں ہے اور عورت اس کے ماتحت۔ اس کے لیے دلیل 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ' (النساء ۴: ۳۴) جیسے نصوص سے دی جاتی ہے، حالاں کہ ان کا ایک مخصوص پس منظر ہے۔ آج کی دنیا میں تیز رفتار سائنس، ٹیکنالوجی اور تمدنی ترقیوں نے یہ ناممکن بنا دیا ہے کہ عورت کو مکمل طور پر مرد کے کنٹرول میں دے دیا جائے۔ آج عورت ہر میدان میں آگے بڑھنا چاہتی ہے، اس کے حوصلوں کو دبایا نہیں جا سکتا''۔[۱۴]

اس کے بعد ان سے مسلسل ملاقاتیں اور گفتگوئیں رہیں۔ آخری جو تفصیلی ملاقات یاد ہے، اس میں رفیق محترم مولانا وارث مظہری، مولانا محمد ذکوان ندوی اور راقم خاک سار نے مشترکہ طور پر کی تھی۔ یہ بڑی یادگار ملاقات تھی اور اس میں نجات صاحب نے تفصیل سے مختلف سوالوں کے جواب دیے تھے۔ ہم لوگوں نے گروپ فوٹو بھی بنوایا جس کو مولانا ذکوان صاحب نے شوٹ کیا تھا۔ حضرت ذکوان کی اِس مہارت پر ہم لوگ حیران رہ گئے تھے۔

۱۴۔ افکار ملی، فروری ۲۰۱۴ء، نئی دہلی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

یہ بات بھی دیکھی گئی کہ نجات صاحب بعض اوقات بعض متعین سوالوں کا جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک ملاقات میں راقم نے ان کے سامنے ایک متعین سوال رکھا: مسلمانوں میں ایک سوچ یہ بھی پیدا ہوئی ہے کہ حکومت، اقتدار کا حصول یا اس کے لیے جدوجہد اسلام کا منشا نہیں۔ مولانا وحید الدین خاں اور جاوید احمد غامدی کے نزدیک یہ اسلام کی سیاسی تعبیر ہے (اقتدار امر موعود ہے، امر مقصود نہیں۔ وحید الدین خاں، حکومت کا نہیں امت کا تصور ہے، جمال البنا معاشرہ مقصود ہے، اقتدار نشانہ نہیں، محمود احمد غازی) آپ کیا سمجھتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ کوئی رائے قائم کرنے کے دو طریقے ہیں: پہلا، استدلالی طریقہ، یعنی نصوص کو دیکھا جائے، ان پر غور و فکر کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام بہت ہو چکا ہے۔ دوسرا، تجرباتی طریقہ، یعنی یہ دیکھا جائے کہ دونوں گروہوں میں (سیاسی تعبیر کے علم بردار و غیر سیاسی اصلاح کے حاملین) اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں کون آگے رہا۔ کس کا کتنا حصہ ہے اور موجودہ حالات میں کس کا contribution زیادہ ہے۔ میدانی تجربہ کیا ہے، یہ ضرور دیکھنا چاہیے۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے، ہمارے ہاں یہ بحث محض اکیڈیمک ہے، عملی نہیں۔ اس ملک میں اسلامی سیاست ہمارا فوری ہدف نہیں، نہ ہی کوئی یہ بات کہہ رہا ہے۔ "... آج سے ۷۰ سال پہلے جب مولانا مودودی اور دوسروں نے حکومت الٰہیہ یا اسلامی حکومت کی باتیں کہی تھیں، اس وقت کی صورت حال جدا تھی۔ اس وقت یہاں انگریز حکمراں تھا اور اس وقت اسلامی سیاست یا اسلام کے اقتدار کی بات سمجھ میں آتی تھی۔ اس وقت کی عبارتوں کو absolute اور مطلق معنوں میں نہیں لیا جانا چاہیے۔ نیک خواہش کی بات الگ ہے، ورنہ ابھی یہاں اسلامی اقتدار کی بات کہنا ایک بہت بعید اور بہت دور کی بات ہے۔"[۱۵] یہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ بعض متعین سوالوں کا جواب دینے سے انھوں نے گریز کیا ہے۔ بعض حضرات نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ لوگ خود آزادی کے ساتھ غور و خوض کریں اور خود کسی نتیجہ تک پہنچیں۔

مقاصد شریعت

مقاصد شریعت پر سلف میں علامہ عزالدین ابن عبدالسلام، امام شاطبی غرناطی اور امام غزالی نے کلام کیا ہے۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الطاہر بن عاشور نے بھی اس سے اعتنا کیا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں

۱۵۔ افکار ملی فروری ۲۰۱۴ء۔

عالمی ادارہ برائے فکر اسلامی (واشنگٹن ڈی سی)[16] نے اس موضوع کو اپنی ریسرچ اور تحقیقی سرگرمیوں کا باضابطہ محور بنایا اور اس پر مختلف زبانوں میں بہت سا لٹریچر شائع کیا اور شاطبی کے نظریۂ مقاصد کو دنیا بھر میں متعارف کرایا۔ ہندوستان میں مذکورہ ادارہ کے اشتراک سے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے بھی اِس کی طرف علما اور طالبان علوم نبوت کو متوجہ کیا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا امین عثمانی اور اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے دوسرے ذمہ داروں نے اس کے لیے علمی و عملی کاوشیں کیں اور ورکشاپ و مذاکرے منعقد کیے۔ تاہم برصغیر کے علما کے لیے یہ موضوع ابھی تک خاصا غیر متعارف ہے، بلکہ زیادہ تر کو اس پر سخت تحفظات ہیں۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی کی مقاصد کے موضوع پر معروف کتاب ''مقاصد شریعت''[17] غالباً ان کی آخری باضابطہ تصنیف ہے، جو پہلے پاکستان سے اور اس کے بعد ہندوستان سے شائع ہوئی ہے۔ نجات صاحب نے ''مقاصد شریعت'' کا استعمال نہ صرف عصر حاضر کے بعض معاشی مسائل کے حل کے لیے کیا ہے، بلکہ بعض سلگتے ہوئے عالمی ایشوز، نیز مختلف فکری، سیاسی و سماجی مسائل کے سلسلے میں ''مقاصد شریعت'' کا حوالہ دیتے ہوئے بعض نئی رائیں ظاہر کی ہیں۔ انھوں نے یورپین افتا کمیٹی اور عالمی فقہ اکیڈمیوں کے، نیز شیخ یوسف القرضاوی وغیرہ کے بعض متنازع فیہ فتووں کا سہارا لے کر بعض ایسی رائیں بھی دیں جن پر برصغیر کے علما کا عموماً سخت موقف رہا ہے۔ اس کتاب کے خلاف بعض روایتی علما نے سخت رد عمل کا اظہار کیا اور جماعت کے بعض اکابر نے بھی غیر علمی رویوں کا اظہار کیا۔ نجات صاحب کی توجہ جب اس جانب دلائی گئی تو انھوں نے کہا کہ ''وہ ناقدین کی باتوں کو سنجیدگی سے پڑھیں گے اور اگر ان کی تنقید میں کوئی وزن محسوس ہوا تو اپنی رائے سے رجوع

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۱۶۔ المعہد العالمی للفکر الاسلامی، فلسطینی نژاد امریکن مسلمان اسکالر و مفکر ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی شہید اور ان کے رفقا نے ۱۹۸۱ء میں واشنگٹن میں قائم کیا تھا، اس کے بعد اس کی شاخیں اور ممالک میں بھی قائم ہوئیں۔ فاروقی کے رفقا میں زیادہ معروف نام ہیں: ڈاکٹر عبد الحمید احمد ابو سلیمان اور شیخ طٰہٰ جابر العلوانی۔ اس ادارہ کی بنیادی فکر اسلامائزین آف نالج تھی، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مختلف موضوعات پر ان حضرات نے سرگرمی سے کام کیا ہے، جن میں سر فہرست مقاصد شریعت کا موضوع بھی ہے۔

۱۷۔ یہ کتاب پہلے قسط وار اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان کے مجلہ ''فکر و نظر'' میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اسی انسٹی ٹیوٹ نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ ہندوستان میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

کر لیں گے۔"[18]

"مقاصد شریعت" میں انھوں نے لکھا:

"اسلام تسلط پسندی (hegemony) کو رد کرتا ہے۔ وہ اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہے نہ کہ مسلمانوں کی غلامی کی طرف ... مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۳ سال دعوت واصلاح وتزکیہ کے کام میں گزرے تھے نہ کہ حصول اقتدار کی مہم میں۔ مکہ میں آپ کے شب وروز کیسے گزرتے تھے اس کا اندازہ قرآن کریم کی ان سورتوں اور آیات کے مطالعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو اس دوران نازل ہوئیں۔" (۲۸۴، ۲۹۰)

بہر حال مقاصد شریعت پر ان کی کتاب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ایک شان دار علمی وفکری خدمت، جس کا ادراک ہمارے فقہی جامد ذہن کو ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کہتے تھے کہ اگلی صدی میں نئی اسلامی تحریک پیدا ہو گی۔ نجات صاحب کی زندگی ایک فکری مسافر کی سی ہے، جو مسلسل فکری ارتقا سے گزر رہا تھا۔ موجودہ زمانے کے مسلمان اہل فکر میں عبد الحمید ابو سلیمان اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، دونوں کے ہاں یہ فکری ارتقا موجود ہے، جو اور علما و دانش وروں میں عنقا ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی آخری زمانہ کی دو انگریزی تحریریں خود اپنا احتساب اور اپنے علمی کاموں کے ناقدانہ جائزہ کی بہترین مثال ہیں:

۱۔ My Life in Islamic Economics۔

۲۔ Islamization of Knowledge: Reflections on Priorities۔

یہ دونوں مضمون ان کے فکری اضطراب، بتدریج فکری ارتقا اور اس راہ میں پیش آنے والی غلطیوں کے ادراک کی غمازی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی تصانیف میں تجدیدی شان پائی جاتی ہے۔ وہ وسعت مطالعہ، نشتر تحقیق اور جرأت دانش سے بہرہ ور تھے۔ ان کی فکری کاوشیں آیندہ زمانے کے لیے نقوش راہ ثابت ہوں گی:

ان کے جانے کا منظر تماشا نہیں
دور تک دیکھیے دور تک سوچیے

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

۱۸۔ ڈاکٹر صاحب کے بھتیجے جناب صدیق صاحب نے آن لائن تعزیتی میٹنگ میں یہ بات بتائی۔

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk
Tel: 021-38682810